درد

(ناول)

رئیس احمد جعفری

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
لاہور — پشاور — حیدرآباد — کراچی

کراچی بک ڈپو
اردو بازار۔ کراچی

(جملہ حقوق محفوظ)

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۲

طبع اول	
طبع دوم	
طبع سوم	سنہ ۱۹۵۷ء
طبع چہارم	سنہ ۱۹۶۳ء
طابع	شیخ نیاز احمد
مطبع	علمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور
قیمت	[redacted] روپے [redacted] پیسے

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
کشمیری بازار۔ لاہور

فہرس

۱۔ یتیم خانہ ۹
۲۔ نیا گھر ۱۴
۳۔ لڑائی اور ملاپ ۲۰
۴۔ جوانی کی آمد آمد ۲۸
۵۔ محبت کی بے تابیاں ۳۹
۶۔ تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے ۴۴
۷۔ رخصتِ ہوش ۵۴
۸۔ پہلے پہل ۶۲
۹۔ یادِ یار ۷۳
۱۰۔ چوری چھپے ۷۸
۱۱۔ مکتوبِ محبت ۸۶
۱۲۔ رشوت ۹۵
۱۳۔ ایک اور مصیبت ۹۸

۱۴- دھوکا ۱۰۵
۱۵- تیمارداری ۱۱۴
۱۶- نیا سوال ۱۱۸
۱۷- ایک اور سانحہ ۱۲۳
۱۸- نیا سابقہ ۱۳۴
۱۹- دل ہی دل میں ۱۳۹
۲۰- تعجب ۱۴۷
۲۱- انکشاف ۱۶۴
۲۲- ہجرِ ناگہاں ۱۷۹
۲۳- ہاں وہ نہیں وفا پرست ۱۸۷
۲۴- نیا علاج ۱۹۴
۲۵- شادی و غم ۲۰۷

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

کہانی ـــــ کی ـــــ کہانی

۱۹۳۵ء میں مولانا شوکت علی مرحوم میرا تعلیمی سلسلہ ادھورا چھڑا کر مجھے جامعہ ملیہ سے بمبئی گھسیٹ لائے اور روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر بنا دیا۔ کالج کی رنگین اور پُرکیف فضا سے پہلی بار نکل کر کشمکش حیات کے میدان میں مجھے کودنا پڑا۔ شوکت صاحب جب تک زندہ رہے میرا "خلافت" سے تعلق قائم رہا۔ ان کی وفات کے بعد — آں قدح بشکست و آں ساقی نماند — والا معاملہ ہوا۔ پھر میں نے "خلافت" سے ترک تعلق کر لیا اور اپنا ذاتی اخبار روزنامہ "ہندوستان" نکالا۔ پھر روزنامہ "انقلاب" کی ادارت مجھے تفویض ہوئی۔ دس بارہ سال تک میرا بمبئی میں قیام رہا اور اس عرصہ میں ناخدایانِ فلم سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ حالانکہ بمبئی فلمی دنیا کا دارالسلطنت تھا۔ پھر میرا پہلا ناول "باجی" شائع ہوا۔ کسی طرح وہ کاردار صاحب تک پہنچا۔ میری طلبی ہوئی اور کاردار صاحب نے پوری محویت اور انہماک کے ساتھ سارا ناول ایک نشست میں پڑھ ڈالا اور پھر بے اختیار ہو کر کہنے لگے ع۔ آمد آں یارے کہ ما می خواستیم۔ کہنے لگے مجھے آپ کے مکالمے بہت پسند آئے۔ اگر ہماری فلموں کے مکالمے اس طرح کے ہوں تو فلمی دنیا میں انقلاب آ جائے۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ پوچھا آپ کیا تنخواہ قبول کریں گے۔ میں نے تنخواہ بتائی۔ بے چون و چرا میری منہ مانگی تنخواہ منظور کر کے ایگریمنٹ پر دستخط کرائے۔

"درد" کی کہانی جب میں نے انھیں سنائی۔ انھوں نے سنتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اسے خود فلمائیں گے۔ پھر میرا اور ان کا "ڈسکشن" شروع ہوا اور تین مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں سینریو مکمل ہوا ڈائیلاگ و مکالمے تکمیل تک پہنچے۔ سیٹ بننے لگے۔ پھر فساد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں اور کاردار صاحب ندی کے دو کنارے بن گئے۔ جو ایک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں کبھی نہیں مل سکتے۔ میری عدم موجودگی میں یہ فلم سیٹ ہو گئی اور تکمیل کو پہنچی۔ "کاغذی تیاریاں" جب تک ہوتی رہیں۔ کاردار صاحب اپنے مصاحبوں اور ندیموں کی دراندازیوں اور

شرارتوں کے باوجود میری بات بالا رکھتے رہے۔ ناانصافی ہوگی، اگر شکر و سپاس کے ساتھ میں اس کا اعتراف نہ کروں کہ جب تک میں کاردار پروڈکشن سے وابستہ رہا، وہ میرا سب سے زیادہ لحاظ اور احترام کرتے رہے۔ میری رائے کو سب سے زیادہ اہمیت اور وقعت دیتے رہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنے معاصرین کی طرح وہ بھی مقاومت اور مزاحمت کے باوجود مصاحبوں اور ندیموں کی خوشامد سے متاثر ہو جاتے ہیں، چنانچہ ہوئے۔ فلم کا جب بزنس شو قلابہ کے ایک سینما میں ہوا تو مجھے بھی کاردار صاحب نے مدعو کیا۔ میں گیا اور کاردار صاحب نے اس کامیاب اسٹوری پر شکیل بدایونی اور نوشاد صاحب وغیرہ کی موجودگی میں مبارکباد دی۔ اس فلم کا جو "رائٹ اپ" (WRIGHT UP) بمبئی کے ممتاز اخبارات "ٹائمز آف انڈیا" "بمبئی کرانیکل" فری پریس جرنل" "ایوننگ نیوز آف انڈیا" وغیرہ میں شائع ہوا، اس میں بھی کاردار صاحب نے از راہ قدردانی مجھے سراہا۔ "شاہجہاں" کی بک لسٹ کے بیک پیج (آخری صفحہ) پر "درد" کا اشتہار ہے۔ اس میں اسٹوری اور ڈائیلاگ (کہانی اور مکالمے) دونوں کا کریڈٹ مجھے دیا گیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مکالموں کا بڑا حصہ میرا ہے، کچھ [illegible]۔ لیکن کراچی آنے کے بعد یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فلم کے ٹائٹل پر اسٹوری رائٹر کی حیثیت سے میرا نام ہے اور مکالمات کاردار پروڈکشن کے ایک منشی کے نام سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میری عدم موجودگی میں سیٹ پر مکالمے کچھ سے کچھ ہو گئے اور یقیناً یہ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ کاردار پروڈکشن کے منشی صاحب ہی کا قابل فخر کارنامہ ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ کاردار صاحب یہ غلط کام کر کے فلم کی مٹی پلید کر دی اور اسی لیے مجھے یہ ناول شائع کرنا پڑا، تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو کہ فلم اسٹوڈیو کے معمل (لیبوریٹری) میں جا کر اچھی کہانی اور اچھے مکالموں کا کیا حشر ہوتا ہے اور کاردار صاحب سے زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

رہے فن کے منشی صاحب، تو ان کا مدار حیات اس کے سوا کچھ نہیں کہ ع دین [illegible]، آئین و سوداگری

کراچی ۲۵ جولائی ۱۹۴۹ء ——— رئیس احمد جعفری

باب ١

یتیم خانہ

آج یتیم خانہ تنویرِ اسلام کا سالانہ جلسہ تھا۔ یہ یتیم خانہ اپنے منتظم شیخ نور میاں کی دیانت و شرافت کی وجہ سے بہت ممتاز تھا۔ یہاں یتیم بچوں کی اچھی طرح پرورش اور نگہداشت ہوتی تھی۔ ان سے بھیک منگوانے کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ ان میں خودداری کا جوہر پیدا کیا جاتا تھا۔ انھیں معقول تعلیم دی جاتی اور ہنر سکھایا جاتا تھا۔ انھیں صاف اور ستھرے طریقے پر رکھا جاتا تھا۔ نور میاں کا سب بچوں کے ساتھ وہی سلوک تھا، جو شفیق باپ کا ہونہار اولاد کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ ننھے اور معصوم بچے بھی انھیں بہت مانتے اور چاہتے تھے۔ ان کے اشاروں پر چلتے تھے اور ان کی بات رد نہیں کرتے تھے۔

نور میاں کی وجہ سے شہر میں یتیم خانہ بہت نیک نام تھا۔ شرفا اور امرا حسبِ امکان اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ سالانہ جلسہ بڑے اہتمام سے ہوتا تھا۔ کسی بڑے آدمی کو صدارت کی دعوت دی جاتی اور شہر کے تمام معززین شرکت کرکے اپنے عطیوں سے نوازتے اور اس طرح سال بھر کا خرچ آسانی سے وصول ہو جاتا۔

صبح سے یتیم خانہ میں جلسہ کا انتظام ہو رہا تھا۔ نور میاں گھبرائے گھبرائے چاروں طرف پھر رہے تھے۔ کبھی ہال کو صاف کرا رہے ہیں، کبھی بورڈنگ میں جھاڑو اپنی زیرِ نگرانی دلا رہے ہیں کبھی بچوں کو نہانے دھونے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے کی تاکید کر رہے ہیں اور چھوٹے بچوں کو پیار کے ساتھ ساتھ ڈانٹ کر تلقین کر رہے ہیں کہ خبردار جو نواب دلاور جنگ کے سامنے کوئی بے ادبی کی، مُنہ سے ایک لفظ بھی بے تُکا نہ نکلنے پائے۔ نواب صاحب ہی پر اس یتیم خانہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔ اگر وہ مطمئن ہو گئے تو ساری ضروریات سال بھر کے لئے پوری ہو جائیں گی۔ لڑکے بھی نور میاں کی ہدایات اور ارشادات پر صدقِ دل سے عمل کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُنھوں نے ساری عمارت کو آئینہ کی طرح صاف شفاف بنا دیا اور خود بھی بن ٹھن کر نواب صاحب کے استقبال کے لئے ہمہ تن انتظار بن گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد حاضرین اور مہمانوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ شہر کے تقریباً تمام معزز اور تعلیم یافتہ اصحاب موجود تھے۔ اتنے میں نواب دلاور جنگ بڑے تزک و احتشام اور جاہ و جلال کے ساتھ تشریف لائے۔ حاضرین نے سرو قد ایستادہ ہو کر ان کا استقبال کیا۔ نواب صاحب وقار کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب اگرچہ دولت مند تھے اور طبقہ اُمرا سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان کے سینہ میں ایک شریف اور حساس دل تھا، جو غریبوں پر رحم کھاتا، یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری کرتا۔ خانماں بربادوں اور بے آسراؤں کو سہارا دیتا تھا۔ وہ اپنے طبقہ کے لوگوں سے اتنی محبت اور

تپاک سے نہیں ملتے تھے۔ جس خلوص اور شفقت سے وہ غریب اور شریف لوگوں سے ملتے تھے۔ نواب صاحب کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا یہی راز تھا۔

نور میاں نے نواب صاحب کو کرسیٔ صدارت پر جلوہ فرما ہونے کی دعوت دی۔ پھر ایک موثر اور دلگداز تقریر میں یتیم بچوں کے حالِ زار کا نقشہ کھینچا۔ بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ امرا اور اصحابِ ثروت کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے عیش و عشرت کے مصارف میں ان تہی دست اور بے نوا بچوں کا حصہ بھی رکھیں۔ یہی بچے آگے چل کر ترقی کر سکتے ہیں۔ اپنے ذہن و دماغ کی صلاحیتوں سے محمد علی جوہر اور محمد علی جناح بن سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ادھ کھلے پھول، بن کھلے مرجھا جائیں اور اپنی بہار نہ دکھا سکیں۔

نور میاں کی تقریر کے بعد، چند بچوں نے ایک نوعمر اور خوبصورت لڑکے کی سربراہی میں کورس کے طرز پر ایک درد بھری نظم سنائی۔ جو یتیمی کے جگر فگار احوال و کوائف، اور اربابِ ثروت سے چارہ سازی اور دستگیری پر مشتمل تھی۔ اس نظم نے جادو کا کام کیا اور اسٹیج پر ہُن برسنے لگا۔ نوٹوں اور روپیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ کم و بیش دس ہزار روپیے آن کی آن میں جمع ہو گئے۔ نواب صاحب نور میاں کی تقریر سے کافی متاثر ہو چکے تھے۔ اس نظم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ انھوں نے جیب سے چیک بک نکالی اور دس ہزار روپیہ کا عطیہ یتیم خانہ کو مرحمت فرمایا۔ جلسہ برخاست ہو گیا۔ نور میاں نے نواب صاحب سے استدعا کی کہ وہ یتیم خانہ کی

عمارت اور بورڈنگ ہاؤس کو بھی بہ چشم خود ملاحظہ فرمالیں۔ نواب صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی۔ انھوں نے ایک ایک کمرے کو دیکھا۔ یتیم بچوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے اور پڑھنے لکھنے کے طور طریقے تفصیل کے ساتھ معائنہ فرمائے۔ جاتے ہوئے جس کمرہ کا انھوں نے معائنہ فرمایا۔ یہاں اتفاق سے وہ لڑکا پھر نظر آیا، جس نے ہال کے اندر درد بھری نظم پڑھ کر ایک سماں پیدا کر دیا تھا۔ نواب صاحب ایک چارپائی پہ بیٹھ گئے اور اس لڑکے سے بڑی شفقت کے ساتھ پوچھا:

"تمھارا نام کیا ہے"؟

وہ ادب سے گردن جھکا کر بولا:

"اقبال"!

"نام تو بڑا اچھا ہے۔ ہاں بیٹے تو بتاؤ تم پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتے ہو"؟

اقبال نے فوراً جواب دیا:

"ڈاکٹر"!

نواب صاحب مسکرائے۔ انھوں نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"شاباش! جن کی ہمت بلند ہوتی ہے، وہ غریبی کی گود میں پل کر بھی سب کچھ بن سکتے ہیں۔ تم ضرور ہو گے ڈاکٹر۔ ہم تمھیں تعلیم دلائیں گے۔ ہم تمھیں ڈاکٹری پڑھائیں گے۔ ہمارے ساتھ چلو گے؟ رہو گے ہمارے ساتھ"؟

اقبال تعجب سے ان کی طرف دیکھنے لگا اور خاموش رہا۔ پھر وہ خوشیاں

سے مخاطب ہوئے :

"بڑا ہونہار بچہ ہے۔ اسے تو آپ ہمیں دے دیجیے!"

نور میاں اس وقت مزے میں تھے، مسکراتے ہوئے بولے :

"بندہ کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اگر یتیم خانے کے سارے بچوں کو حضور اپنے سایہ میں جگہ دیں تو زہے قسمت!"

نواب صاحب مسکرائے۔ انھوں نے فرمایا :

"پہلے میرا ایک تجربہ کامیاب ہو لینے دیجیے!"

نور میاں نے اقبال سے کہا :

"بیٹے اپنی قسمت پر فخر کرو کہ تم نواب صاحب کے سایہ میں پلو اور پڑھو گے۔ اٹھاؤ سامان، نواب صاحب تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے!"

اقبال ایک چھوٹی سی پوٹلی میں اپنا مختصر سا سامان باندھ کر نواب صاحب کے ساتھ ہو لیا اور وہ اسے لے کر اپنی شاندار موٹر میں بیٹھے اور دولت سرا کی طرف روانہ ہو گئے!

باب ۲

نیا گھر

ایک شاندار محلسرا کے پھاٹک پر نواب صاحب کی موٹر آ کر رُکی۔ ملازم نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ نواب صاحب نیچے اُترے۔ پھر اُنھوں نے موٹر کے اندر جھانک کر کہا:

"آؤ اقبال، آج سے تم اس گھر میں رہو گے!"

اقبال موٹر سے اُترا۔ نوکر چاکر ادب سے صف بستہ کھڑے ہوئے تھے۔ نواب صاحب محلسرا کے شاندار راستوں سے گزرتے ہوئے اقبال کے ساتھ اندر آئے۔ ابّا ابّا کہہ کر ان کی معصوم بچّی ثریّا چمٹ گئی، اور اقبال کو تکنے لگی۔ اُنھوں نے اسے پیار کیا اور بیگم صاحبہ سے کہا:

"بڑا ہونہار اور پیارا بچّہ ہے!"

"ہاں یہ تو میں دیکھ رہی ہوں!"

"میں اسے لے آیا"

"کون ہے یہ؟ کہاں سے لائے ہو؟"

"یہ ایک یتیم بچّہ ہے، یتیم خانہ سے لایا ہوں (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ نہیں جانتا، ماں باپ کی گود کیا چیز ہوتی ہے، اسے نہیں معلوم باپ کی

شفقت کسے کہتے ہیں؟ میں اس کا باپ بن چکا۔ کیا تم اس کی ماں بننا منظور کروگی؟

اقبال حسرت سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُنھوں نے بڑے پیار سے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور کہا:

"ہاں، میں اس کی ماں بنوں گی اور اسے اتنا ہی چاہوں گی جتنا ثریا کو چاہتی ہوں۔ وہ میری ایک آنکھ ہے، یہ دوسری آنکھ بن جائے گا!"

نواب صاحب نے ثریا سے کہا:

"ارے بیٹی تم تو کھڑی ہوئی ہو اپنے مہمان کو گھر اور باغ کی سیر تو کراؤ!"

ثریا نے اقبال کا ہاتھ پکڑ لیا، اور آگے بڑھ گئی۔ اقبال کشاں کشاں اس کے ساتھ چل پڑا۔ دونوں کی عمر میں مشکل سے دو برس کا فرق ہوگا۔ وہ تو ساڑھے نو سال کا تھا۔ یہ سات ساڑھے سات برس کی۔ لیکن دونوں کی صورت اور حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور خوشبودار پھول تھی۔ جس کی مہک سے دماغ تازہ ہوتا تھا۔ چہرے پر خون کی سُرخی، بدن پر امیرانہ کپڑے اور یہ ایک مسلی ہوئی اور روندی ہوئی پتی تھی، جس میں نہ روپ تھا، نہ رنگ، نہ مہک۔ چہرہ سوکھا ہوا، کپڑے میلے، آنکھوں میں مایوسی کی جھلک، حال میں بیماروں کی سی کمزوری، باتوں میں لحاظ اور ادب۔ ثریا اپنے ننھے مہمان کو ساتھ لے تو آئی، لیکن کچھ زیادہ خوش نہیں تھی وہ دل ہی دل میں اپنے باپ پر خفا ہو رہی تھی کہ کسے لا کر میرے پلے ڈالا ہے جس کی صورت دیکھو تو معلوم ہوتا ہے بس رویا ہی چاہتا ہے۔ جس کے

کپڑے میری خادماؤں کے لڑکوں سے بھی بدتر ہیں۔ جس کی باتوں میں ایک عجیب قسم کی بے بسی جھلکتی ہے، لیکن باپ کا حکم وہ ٹال نہیں سکتی تھی۔ اقبال کو لے کر اپنے باغیچہ میں آئی اور سیر کراتے ہوئے بولی:

"یہ باغیچہ صرف میری سیر کے لیے حضور ابا نے تیار کرایا ہے!"

اقبال خاموش رہا۔ ثریا آگے بڑھی اور پھر بولی:

"یہ چبوترہ دیکھ رہے ہو نا؟"

وہ ادب سے بولا:

"جی، دیکھ رہا ہوں!"

ثریا نے ایک شان پندار سے کہا:

"اس پر فرش بچھتا ہے۔ پھر شامیانہ نصب ہوتا ہے۔ اچھے اچھے قالین اور غالیچے بچھائے جاتے ہیں۔ پھر میں اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ملکہ بن کر یہاں بیٹھتی ہوں۔ وہ ناچتی ہیں، گاتی ہیں، میرا دل بہلاتی ہیں!"

اقبال خاموش ثریا کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور ایک فوارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"یہ فوارہ تم نے دیکھا؟"

"جی!"

"یہ ابا حضور نے میرے لیے بنوایا ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے؟"

"جی بہت!"

ایک جگہ رک کر ثریا نے پھر اقبال کو مخاطب کیا:

"ساون میں ہم یہاں جھولا ڈال کر جھولتے ہیں، اور اتنے بڑے بڑے پینگ لیتے ہیں کہ تم دیکھو تو ڈر جاؤ!"

اور غریب اقبال واقعی سہم کر ثریا کو دیکھنے لگا۔ اس کی کیفیت کا احساس کیے بغیر، ثریا اپنا شاہنامہ پھر سنانے لگی۔ بولی:

"میری سالگرہ کے دن تو بڑی بہار ہوتی ہے۔ ۹ من تیل سے محلسرا میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ دیے ایسے ٹمٹماتے ہیں جیسے آسمان پر تارے دُور دُور تک یہاں کی روشنی جاتی ہے۔ میرا سال گرہ کا جوڑا چھ مہینہ تک تیار ہوتا رہتا ہے۔ شہر بھر کے رئیسوں کی لڑکیاں خوب بن سنور کر اپنے ٹھاٹھ دکھاتی ہوئی آتی ہیں، پھر مجھے موتیوں میں تولا جاتا ہے!"

اس دفعہ اقبال کا منہ کھلا۔ اس نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا:

"پھر کیا ہوتا ہے؟"

ثریا نے بڑے چاؤ سے جواب دیا:

"پھر؟ ——— پھر وہ موتی، بہت سی اشرفیاں اور روپے غریبوں اور یتیموں کو بانٹ دیے جاتے ہیں!"

پھر ثریا نے اقبال سے پوچھا:

"کیوں جی یتیم لوگ کون ہوتے ہیں؟"

اقبال نے جواب دیا:

"غریبوں کی ایک قسم یتیم بھی ہوتے ہیں!"

"تو تم بہت غریب ہو؟"

سے منائیں گے !"

اقبال نے ممنون نگاہوں سے ثریّا کی طرف دیکھا اور پھر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ یہ لوگ گھومتے گھومتے پھر فوارے کی طرف آ گئے تھے۔ یہ جگہ اقبال کو بھلی معلوم ہوئی۔ اس نے چاہا کچھ دیر یہاں بیٹھے اور اس نظارہ سے لطف اندوز ہو۔ اس نے ثریّا سے کہا :

"آئیے، یہاں بیٹھیں !"

اور وہ واقعی بیٹھ گیا۔ ثریّا نے کھڑے کھڑے جواب دیا :

"نہیں ـــــ ہم گھاس پھوس پر نہیں بیٹھتے !"

اقبال جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا، اور ثریّا اسے لے کر محلسرا واپس چلی گئی !

"جی بہت زیادہ غریب ——— جس کا کوئی سہارا نہیں، جس کا کوئی گھر نہیں، جس کا کوئی سرپرست نہیں، جس کا باپ مر چکا، ماں اللہ کو پیاری ہوئی!"

ثریا نے حیرت سے اقبال کی باتیں سنیں۔ وہ پورے طور پر ان باتوں کی تہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:

"تم بھی تو بتاؤ، تمھاری سالگرہ میں کیا کیا ہوتا ہے؟"

اقبال خاموش رہا۔ ثریا نے پھر تقاضہ کیا:

"بتاؤ نا، بتاتے کیوں نہیں؟"

اقبال نے بڑی مسکینیت سے کہا:

"میری سالگرہ؟"

"ہاں تمھاری، بتاؤ!"

"اب تک تو میری سالگرہ منائی نہیں گئی!"

ثریا کو بڑا تعجب ہوا، اس نے کہا:

"ارے یہ کیوں؟"

"غریب جو ہوں، میرا کوئی ہے جو نہیں!"

بڑی شان سے ثریا نے پوچھا:

"یہ بات ہے؟"

"جی ہاں!"

"تم فکر نہ کرو، ہم اپنے ساتھ تمھاری سالگرہ بھی بڑی دھوم دھام

باب ۳

لڑائی اور ملاپ

کئی ہفتے گزر گئے!

ایک روز کا واقعہ ہے کہ ثریا سنگار میز کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ایک ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ دو خادمائیں دائیں بائیں کھڑی اس کے بال سنوار رہی تھیں۔ اس نے آئینہ میں اپنا نکھار دیکھا۔ اس وقت وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اتنے میں ایک کنیز حاضر ہوئی۔ ثریا نے آنکھ اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ادب سے بولی:

"محفل تیار ہے!"

ثریا اپنے کمرہ سے نکلی اور سیدھی اقبال کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ ایک کمبل اوڑھے کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے ثریا کو آتے ہوئے نہیں دیکھا بدستور پڑھنے میں مصروف رہا۔ وہ کمر پر شان سے ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر تک اقبال کو گھورتی رہی۔ پھر اس کے پاس پہنچ کر بولی:

"ہم کھڑے ہیں اور تم بیٹھے ہو۔ آخر تمھیں تمیز کب آئے گی؟"

اقبال جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا:

"میں نے آپ کو دیکھا نہ تھا!"

وہ اسی شان سے بولی:

"کیوں نہیں دیکھا؟"

"غلطی ہو گئی، معاف فرمائیے!"

"ہم نے تمھیں معاف کیا۔ لیکن آئندہ ایسی بے ادبی نہ ہو!"

"بہت خوب!"

"آؤ ہمارے ساتھ آؤ!"

"جی!"

"ہمارے ساتھ آؤ ـــــ ہر چاندنی رات کو ہم اپنے باغیچہ میں بیٹھ کر پریوں کا ناچ دیکھتے ہیں!"

"پریوں کا ناچ!" اقبال کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا:

"پریوں کا ناچ دکھائیں گی آپ!"

"ہاں ہاں چلو، اٹھو، جلدی کرو!

اقبال ثریا کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دل میں بہت خوش تھا کہ آج پریوں کا ناچ دیکھے گا۔ چلتے چلتے ثریا ٹھٹکی۔ اس نے اقبال پر نظر ڈالی اور کہا:

"ان میلے کچیلے کپڑوں میں چلو گے؟"

اقبال نے بیچارگی کے ساتھ اپنے میلے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ثریا کے زرق برق کپڑوں کو دیکھا اور حسرت کے ساتھ کہا:

"جی میرے پاس تو یہی ہیں!"

نواب صاحب نے آتے ہی اقبال کے لیے نئے کپڑے سلوانے کی بیگم صاحبہ کو ہدایت کر دی تھی۔ چار پانچ جوڑے سل کر آج ہی آئے تھے۔ ان میں سے ایک ثریا اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس نے اقبال سے کہا:

"لیکن ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ تم ابھی آدمی بنے جاتے ہو!"

پھر اس نے ملازمہ سے ایک ملکہ کی شان سے کہا:

"تعمیل ہو!"

وہ ملازمہ اقبال کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر میں اطلس کی ایک خوبصورت شیروانی، اچھا سا چوڑی دار پاجامہ اور ایک زریں ٹوپی پہنا کر باہر لائی۔ اب وہ واقعی نواب زادہ معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے آئینہ تھا۔ آئینہ میں اسے اپنی شاندار تصویر نظر آئی۔ اس حلیہ میں اپنا نکھرا ہوا رنگ دیکھ کر وہ خود دنگ رہ گیا۔ ثریا بالکل پاس کھڑی تھی۔ وہ مسکرائی اور گویا ہوئی:

"اب کیسے لگتے ہو؟"

اقبال مسکرایا۔

"آدمی!"

ثریا نے کہا:

"ہاں اور کیا —— اور یہ چیتھڑے یہ لے جاؤ انھیں جلا ڈالو!"

اقبال نے ایک نظر اپنے پرانے اور میلے کپڑوں پر ڈالی اور کہا:

"یہ میرے دکھ درد کے پرانے ساتھی ہیں۔ انھیں میں جلا نہیں سکتا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے وہ کپڑے اٹھا لیے۔

ثریّا کو اقبال کی اس حرکت پر بڑا غصّہ آیا۔ اس کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا:

"جنگلی"

اور وہ برہمی کے عالم میں کمرہ سے نکلی اور چلی گئی۔ اقبال ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ یہاں سے نکل کر ثریّا اپنی سجی سجائی محفل میں پہنچی۔ وہ مسند پر نیم دراز آرام فرما تھی۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی سہیلیاں بڑی آن بان اور سج دھج سے گانا سُنا رہی تھیں اور ناچ دکھا رہی تھیں۔

اقبال بدستور مغموم و پریشان اپنے کمرہ میں کھڑا تھا۔ ثریّا کے الفاظ نے اس کے دل کی دنیا تہ و بالا کر دی تھیں۔ یہ الفاظ تیر کی طرح لگے تھے جا کر اس کے ننھے سے دل میں۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا اپنے کمرہ میں پہنچ کر اس نے پھر وہی پُرانا اور بوسیدہ لباس پہن لیا، اور وہ قیمتی لباس ایک کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

"یتیم کی قسمت اتنی بلند نہیں ہوتی کہ وہ کسی نواب کے محل میں کھپ سکے۔"

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ محلسرا سے چلا جائے گا۔ میز پر بیٹھ کر ایک کاغذ پر چند سطریں لکھنے لگا۔ یہ نواب صاحب کے نام الوداعی پیام تھا۔ ثریّا محفل رقص و سرود برخاست کر کے اپنے سونے کے کمرے میں جا رہی تھی کہ اقبال کے کمرہ کے سامنے سے اس کا گزر ہوا۔ وہ دو چار قدم آگے نکل گئی

رُکی گھوم کر دیکھا اور پھر چل کر کمرہ میں آ گئی۔ پھر کچھ اور خیال آیا اور مُنہ بگاڑ کر کمرہ کی طرف چل دی۔ لیکن کچھ سوچ کر پھر واپس مُڑی۔ اتنے میں اقبال اپنا الوداعی پیام ختم کر کے اور اسے میز پر چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکلا۔ دروازہ پہ ثریّا کھڑی اسے تک رہی تھی۔ اقبال نظریں جھکائے اس کے پاس سے گزر گیا۔ ثریّا نے پکارا،

"اقبال!"

وہ جاتے جاتے رُک گیا۔ ثریّا اس کے قریب آئی۔ بڑی تمکنت سے بولی:

"جا رہے ہو؟"

"جی، یہی ارادہ ہے!"

"تو جاؤ"

اور وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی اپنے کمرہ کی طرف چلی گئی۔

اقبال شکستہ دلی کی حالت میں ڈیوڑھی کی طرف گیا۔ یہاں نواب صاحب سے دوچار ہوا۔ وہ باہر سے اندر آ رہے تھے اور یہ اندر سے باہر جا رہا تھا۔ انھوں نے اقبال کی مغموم و یاس آس کیفیت دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ضرور ثریّا سے لڑائی ہوئی ہے۔ وہ اقبال کے قریب آئے اور شفقت کے ساتھ پوچھا:

"کہاں جا رہے ہو بیٹا؟"

اقبال نے نظریں جھکا کر آہستہ سے جواب دیا:

RIZVIA GIRLS SECONDARY SCHOOL
LIBRARY

"واپس جا رہا ہوں!"

"معلوم ہوتا ہے تمھارا ثریا سے جھگڑا ہو گیا کچھ۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

اقبال نے تائید میں گردن ہلا دی۔ نواب صاحب نے کہا:

"مگر بھئی اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم سے کیوں روٹھ گئے تم؟"

اقبال کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا رہا۔ نواب صاحب نے کہا:

"آؤ ہمارے ساتھ، ہم ثریا کو سمجھا دیں گے!"

اقبال نواب صاحب کے ساتھ ساتھ اندر چلا آیا۔ وہ سیدھے ثریا کے کمرے میں پہنچے، اور اس سے پوچھا:

"اقبال کیوں واپس جا رہا ہے؟ کیا تم لڑ پڑیں اس سے؟"

وہ آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے، بھولا سا منہ بنائے ہوئے بولی:

"آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں۔ انہی سے پوچھ لیجیے!"

"کیا پوچھ لوں؟"

"قصور میرا ہے یا اُن کا؟"

"تم ہی بتاؤ نا کچھ؟"

"یہ لیجیے ان کا رقعہ!"

ثریا اقبال کے کمرہ سے وہ رقعہ لے آئی تھی، جو اس نے جاتے جاتے نواب صاحب کے نام لکھا تھا۔ نواب صاحب نے اقبال کا رقعہ پڑھا۔ وہ چپ چاپ گردن جھکائے کھڑا تھا۔ انھیں یقین ہو چکا تھا۔ اقبال بے قصور

ہے ساری شرارت ثریا کی ہے۔ انھوں نے بڑے پیار سے ثریا سے کہا :

"بیٹی ہر ایک سے نہیں جھگڑا کرتے!"

ثریا روٹھی ہوئی بولی :

"میں کہاں جھگڑتی ہوں ابا حضور!"

"پھر یہ ابھی کیا ہوا تھا؟ اقبال کیوں جا رہا تھا؟"

"میں جھگڑی تھی یا یہ؟ آپ بھی انہی کا ساتھ دینے لگے!"

ثریا رونے لگی۔ نواب صاحب نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا اور کہا :

"بیٹی ناسمجھی کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ جو یتیموں سے جھگڑا کرتا ہے اللہ میاں اُس سے خفا ہو جاتے ہیں۔ ہاں!"

ثریا سہم گئی۔ وہ بڑے بھولے انداز میں آسمان کی طرف دیکھ کر گویا اللہ میاں سے مخاطب ہو کر بولی :

"اب نہیں کروں گی یہ قصور!"

نواب صاحب نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا، اور کہا :

"شاباش!"

پھر وہ اقبال سے مخاطب ہوئے :

"کیوں بیٹے اب تو نہیں جاؤ گے؟"

وہ ادب سے بولا :

"جی نہیں!"

"اب تم ثریا سے خفا تو نہیں ہو؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"جی بالکل نہیں"

"اب تو اس نے اپنے قصور کی معافی بھی مانگ لی!"

اقبال نے کہا:

"سچ پوچھیے تو قصور میرا ہی تھا۔ معافی مجھے مانگنی چاہیے تھی۔"

نواب صاحب نے ثریا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"دونوں معافی مانگ رہے ہیں اور دونوں قصوروار نہیں ہیں۔ کیوں بیٹی معاف کر دیا تم نے اقبال کو؟"

وہ اٹھلا کر بولی:

"کر دیا!"

نواب صاحب نے اقبال کو بھی اپنی آغوش میں لے کر پیار کیا۔ اور دونوں سے کہا:

"شاباش، اب نہ لڑنا کبھی!"

ثریا نے کہا:

"لیکن ان سے کہہ دیجیے۔ میرا کہنا مان لیا کریں۔ حجت نہ کیا کریں!"

نواب صاحب ہنستے ہوئے اپنے کمرہ میں چلے گئے اور یہ دونوں بچے گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا!

باب ۴

جوانی کی آمد آمد

زمانہ کروٹیں بدلتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ انقلاب آتے رہے۔ ثریا اب ایک ننھی سی چھوکری نہیں، دوشیزہ تھی۔ ایک مہکتا ہوا پھول جس میں سے جوانی اور زندگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اُس کے حسن میں اب وقار آگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب شباب مچل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس کے پاس بیٹھنے سے دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اس کی باتیں سننے سے دل کی دنیا میں ہل چل مچ جاتی تھی۔ وہ جس طرف نظر بھر کے دیکھ لیتی تھی وہاں رعنائی اور زیبائی، حسن و شباب اور کیف و زندگی کی لہریں اُٹھنے لگتی تھیں اور یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ اب وہ یتیم خانہ سے آیا ہوا، ایک ملول و مغموم چھوکرا نہیں تھا۔ حسن و شباب کی جیتی جاگتی تصویر، تنومند اور خوبصورت، خوش اندام اور دل فریب، وجیہہ اور شکیل۔ اس کی باتوں میں رس تھا۔ اس کی شخصیت میں جادو تھا۔ وہ باتیں کرتا تھا تو جی چاہتا تھا سُنے جائیے۔ وہ پاس بیٹھتا تھا، تو جی چاہتا تھا، یہ کبھی نہ اُٹھے۔ یونہی بیٹھا رہے۔ یونہی باتیں کرتا رہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ پر مرور ایام اور گردشِ زمانہ کا اثر ہو چکا تھا۔ ان کی جوانی رخصت ہو رہی تھی۔

اور بڑھاپا ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

آج نواب صاحب کے ہاں دوہری مسرّت کا سماں تھا۔ اقبال نے ڈاکٹری کے امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کر لی تھی اور ثریا نے عمر کی سترھویں منزل میں قدم رکھنا تھا۔ اس کا جشن سال گرہ دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ نواب صاحب نے گھر میں بیٹی کو سال گرہ پر مبارک اور درازی عمر کی دعائیں دیں۔ باہر آئے تو اقبال اپنی ڈگری لیے ہوئے موجود تھا۔ نواب صاحب نے اس کی کامیابی پر اظہار خوشنودی کیا اور امید ظاہر کی کہ وہ خلق خدا کی خدمت کرکے ان کا اور اپنا نام دنیا میں روشن کرے گا۔ ایک بہت بڑا میدان خدمت خلق کا اللہ نے اسے عطا کیا ہے۔

اقبال نے ادب کے ساتھ کہا:

"اس وسیع دنیا میں میرا کوئی نہ تھا۔ آپ نے مجھے پناہ دی۔ آپ نے مجھے سہارا دیا۔ آپ نے مجھے خاک سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں!"

نواب صاحب نے شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"کیا کہتے ہو اقبال! یوں نہ کہو۔ یوں سمجھو کہ میرا گھر تاریک تھا، تم نے آکر روشن کر دیا۔ میرا دل مغموم تھا، تم نے آکر اسے خوشی کی دولت دی۔ میں عصائے پیری سے محروم تھا۔ تم میرے بڑھاپے کا سہارا بن گئے۔ تمھیں میں اولاد کی طرح چاہتا ہوں۔ تم میں اور ثریا میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں آفتاب و ماہتاب بن کر، میرے اس ویران اور

سنسان گھر میں ہمیشہ چمکتے اور جگمگاتے رہو!"

اقبال سر جھکائے نواب صاحب کی دل سے نکلی ہوئی باتیں سن رہا تھا، اور اس کا دل، اپنے اس محسن کی شفقت و محبت سے بھرپور تھا۔
نواب صاحب نے کہا،

"بیٹے! آج ثریا کی سالگرہ ہے!"

"جی مجھے معلوم ہے!"

"ماشاءاللہ، اب وہ سترھویں سال میں قدم رکھ رہی ہے!"

"خدا آپ کو ایسی بہت سی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے!"

"آج اس کی تمام سہیلیاں آئیں گی، گھر میں بہت سے مہمان آئیں گے۔ میرے دوست، بیگم کی ملنے والیاں، سارا انتظام تمھارے ہی سپرد ہے۔ خیال رکھنا۔ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے!"

"بہت خوب، ایسا ہی ہوگا!"

نواب صاحب، اپنی مردانی نشست گاہ میں جاکر شطرنج کھیلنے لگے اور اقبال تقریب سالگرہ کے اہتمام و انصرام میں مصروف ہوگیا۔ نواب صاحب کی طبیعت میں سادگی تھی، اور بیگم صاحبہ، نمود و نمائش کی پرستار تھیں۔ وہ چاہتے تھے، یہ تقریب سادگی سے انجام پائے اور یہ مچلی ہوئی تھیں۔ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ میں تو اپنے دل کا ہر ارمان نکالوں گی۔ اقبال پورے انہماک و دلچسپی سے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں مصروف و منہمک تھا۔

باہر میدان میں بہت سی آتش بازیاں، پھلجھڑیاں اور ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور اس تقریب کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ دریچہ میں کھڑے یہ دلچسپ منظر دیکھ رہے تھے۔ دونوں بے حد خوش تھے۔ اس وقت نواب صاحب بھی ترنگ میں تھے۔ اُنھوں نے بیگم صاحبہ سے کہا:

"بیگم!"

وہ مخاطب ہوئیں:

"کچھ مجھ سے کہہ رہے تھے آپ!"

"ہاں! تمھی سے کہہ رہا تھا۔"

وہ بولیں:

"کہیئے! چُپ کیوں ہو گئے؟"

نواب صاحب نے کہا:

"کچھ یاد ہے؟"

"کیا یاد آ رہا ہے آپ کو؟"

"کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!"

بیگم صاحبہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ مسکرا دیں۔ اُنھوں نے کہا:

"کیا مطلب؟ —— بوڑھے مُنہ مہاسے، لوگ چلے تماشے۔"

"یہ بات نہیں ہے بیگم!"

"پھر کیا ہے، کچھ کہیئے بھی تو!"

"مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آ گیا

ہا، آتا ہے یاد جس دم گزرا ہوا زمانہ

"اے ہے، کون سی بات یاد آ گئی آج؟ یاد آ گئی ہو گی وہی موئی چوک کی نائکہ، دُلاری جان، جس کے لیے خود کشی کیے لیتے تھے۔ اور کیا یاد آیا ہو گا، لے میرا منہ نہ کھلواؤ!"

نواب صاحب نے ایک قہقہہ لگایا:

"یہ تو شادی کے پہلے کی باتیں ہیں بیگم!"

"اے ہے شادی کے بعد کون سے ولی اللہ بن گئے تھے؟ میں سب جانتی ہوں!"

"بیگم، تم نے تو بگڑ کر، اور زیادہ مجھے وہ پُرانا زمانہ یاد دلا دیا!"

"خدا کی شان، کون سا زمانہ!"

"وہ زمانہ جب پہلے پہل تم اس گھر میں دُلھن بن کر آئی تھیں۔ جب میں نے تمھارا ڈولا اُتارا تھا۔ جب دن دن بھر تم ناز اُٹھواتی تھیں۔ اور رات رات بھر خوشامدیں کراتی تھیں!"

بیگم صاحبہ کا غصّہ اُتر گیا۔ وہ مسکرا دیں۔ شاید پُرانا زمانہ اُنھیں بھی یاد آ رہا تھا۔ بڑے چاؤ سے کہنے لگیں ایک ٹھنڈی سانس لے کر:

"دن اسی طرح بیتتے رہتے ہیں۔ جوانی دبے پاؤں چلی جاتی ہے اور بڑھاپا بے کہے سُنے نمودار ہو جاتا ہے۔"

نواب صاحب نے مخمور نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"لیکن تمھیں بوڑھا کون کہتا ہے۔ تم پر تو جوانی آج بھی پھٹی پڑ رہی ہے۔ میری طرف دیکھو، مجھے دیکھو!"

بیگم پھر بھڑکیں:

"یہ آج تمھیں ہوا کیا ہے؟"

"بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں تو دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے کوئی!"

"کچھ بھی نہیں، تمھیں تو بڑھپس سوار ہے، یہیں کھڑے رہو گے یا باہر بھی جاؤ گے۔ مہمانوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ خود بھی یہیں کھڑے ہو اور مجھے بھی روکے ہوئے ہو۔ میں تو جاتی ہوں!"

"جاؤ لیکن بھول نہ جانا!"

وہ جاتے جاتے رکیں۔

"اے واہ، کیا نہ بھولوں؟ تمھارا مطلب کیا ہے آخر؟"

"ایں یہ بے مروّتی!"

وہ مسکراتی ہوئی زنان خانے میں چلی گئیں اور نواب صاحب اپنی مردانہ نشست گاہ میں تشریف لے گئے۔ جہاں دوستوں اور شناساؤں کا ہجوم جمع تھا۔

پائیں باغ میں ثریّا کی سکھیوں اور سہیلیوں نے ایک محفل مشاعرہ ترتیب دی تھی۔ اس مجمع میں زبیدہ بھی موجود تھی۔ ثریّا کی خالہ زاد بہن، بڑی شوخ اور چنچل، بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی اس لڑکی کی۔ ثریّا پر بھی ایسی چوٹیں کرتی تھی کہ جواب دیتے نہیں بن پڑتا تھا۔ اس کی آمد نے محفل کی گرما گرمی اور دلچسپی میں اور

زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ آج کے مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام لڑکیاں غزل سنانے پر مجبور تھیں۔ ہر لڑکی کے لیے شرط تھی کہ وہ کسی مشہور شاعر کی بالکل اسی کے لب و لہجہ میں غزل سنائے۔ چنانچہ ان لڑکیوں نے مختلف شعرا کا روپ بھر کے، اُنہی کے طرز اور لَے میں، اُنہی کے اشعار سُنانے کا پروگرام بنایا تھا!

آخر زبیدہ کے اہتمام و انصرام میں مشاعرہ شروع ہُوا۔ اور اس مشاعرہ نے واقعی ایک سماں پیدا کر دیا۔ ثریّا ایک شاندار مسند پر نیم دراز تھی۔ وہ گویا صدرِ مشاعرہ تھی۔ اس کی سکھیاں باری باری سے شمع اپنے سامنے رکھ کر غزلیں سنا رہی تھیں۔ ان میں کوئی اختر شیرانی تھی، کوئی جگر مرادآبادی، کوئی سیماب اکبرآبادی تھی۔ کوئی حفیظ جالندھری۔ جوش ملیح آبادی بننا بڑا مشکل تھا۔ لیکن زبیدہ نے جب جوش ملیح آبادی کے رنگ میں، بالکل انہی کی طرح رباعیاں پڑھنا شروع کیں، تو ساری محفل پر ایک سنّاٹا چھا گیا۔ لڑکیاں ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ بڑی دیر تک یہ محفلِ مشاعرہ جاری رہی۔

اندر کا سارا کام زبیدہ نے بڑے سلیقہ اور انتظام سے سنبھال لیا تھا۔ باہر کے کاموں کی ذمّہ داری اقبال پر تھی اور وہ خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض سے عہدہ برا ہو رہا تھا۔ یہاں بھی دھوم دھڑکے کی کوئی کمی نہ تھی۔ بیگم صاحبہ نے دُلاری جان کا ذکر کر کے نواب صاحب کو واقعی پُرانی باتیں یاد دلا دی تھیں۔ انھوں نے سوچا۔ اور تو کچھ نہیں کر سکتے۔ لاؤ محفلِ رقص و سرود ہی منعقد کر ڈالیں۔ چنانچہ مردانے میں ایک مشہور طائفہ بلوایا گیا اور ناچنے گانے کی محفل قائم ہو گئی۔

اقبال کسی کام سے اندر کمرہ میں گیا۔ کمرہ ذرا الگ تھلگ سا تھا۔ راستہ میں اس کی ثریا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ پھولوں اور گجروں سے لدی، خوشبو میں بسی، برآمدہ کی طرف آتی دکھائی دی۔ اقبال سامنے آگیا۔ اس نے ثریا کو مخاطب کر کے کہا:

"اس مبارک تقریب پہ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔"

ثریا جاتے جاتے مسکرائی اور ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے کہا:

"بس یہ خالی خولی مبارکباد ہی؟"

ایک تاثر کے عالم میں اقبال نے جواب دیا:

"میں دل سے نکلی ہوئی دعا دے سکتا ہوں۔ آپ کے شایانِ شان کوئی تحفہ نہیں دے سکتا!"

"کیوں؟"

"میں فقیر زادہ، آپ نواب زادی!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتا۔ ایاز قدر خود بشناس۔"

"یہ نہ کہیے۔ ابا حضور یا امی جان نے یہ باتیں سن لیں تو انہیں بہت صدمہ ہوگا!"

"کس بات کا؟"

"آپ کو شاید معلوم نہیں۔ یہ دونوں آپ کو کتنا چاہتے ہیں؟"

"جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں۔ میرے جسم کا رواں رواں جانتا

مانتا ہے!"

"پھر آپ نے یہ بات کیوں کہی۔ وہ مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں کرتے!"

"ٹھیک ہے ثریا!"

"اگر وہ فقیر ہیں تو آپ بھی فقیر ہیں۔ وہ نواب ہیں تو آپ بھی نواب ہیں!"

"واقعی نواب صاحب مجھے اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ لیکن...!"

ثریا نے بات کاٹ کر شوخی کے لہجہ میں کہا:

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مانیے آپ نے غلطی کی!"

"مانتا ہوں!"

"وعدہ کیجیے۔ آپ ایسی غلطی نہیں کریں گے!"

"وعدہ کرتا ہوں!"

"عہد کیجیے، اب ایسا خیال بھی آپ کے دل میں نہیں آئے گا!"

"سچے دل سے عہد کرتا ہوں!"

"آج کے دن میری سکھیوں اور سہیلیوں نے، رشتہ دار خاتونوں نے، امی جان کی دوستوں نے، ابا حضور کے دوستوں کی بیویوں نے مجھے ہزاروں روپے کے قیمتی تحفے دیے ہیں!"

"ضرور دیے ہوں گے!"

"لیکن آپ کو ایک بات بتاؤں؟"

"ضرور بتاؤ!"

"مجھے کسی بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے تحفہ سے اتنی خوشی نہیں

ہوئی جتنی آپ کے سادے اور سچّے الفاظ سے ــــــــ ان قیمتی اور نادر تحفوں میں نمائش تھی، نمود کا جذبہ تھا، طلب و تقاضہ تھا، لیکن آپ کے ان بے لوث اور سچّے بولوں میں صرف سچائی تھی اور میرے نزدیک اس سے بڑھ کر کسی کی قیمت نہیں!"

اقبال نے ممنون نظروں سے ثریّا کو دیکھا اور کہا:

"امارت کی گود میں پلنے کے بعد بھی آپ کے یہ الفاظ سن کر میں کہہ نہیں سکتا، میری خوشی کا کیا عالم ہے؟"

ثریّا نے ایک برق ریز تبسّم کے ساتھ کہا:

"اور آپ نے مجھے کوئی مادّی تحفہ نہیں دیا، تو ملول کیوں ہیں؟ آپ نہیں جانتے۔ آپ خود بھی تو ایک تحفہ ہیں!"

یہ برجستہ فقرہ سن کر، اقبال چونک پڑا۔ ثریّا نے اپنے الفاظ کی نزاکت سمجھ لی اور کہا:

"سچ! ــــــ ابّا حضور اکثر کہا کرتے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں، اقبال ایک بڑا اچھا تحفہ ہے۔ جو قدرت نے ہمیں عطا کیا ہے۔ یقین نہ ہو تو پوچھ لیجیے گا ان سے!"

"یہ ان کی محبت اور نوازش ہے۔ اسی محبّت اور نوازش نے میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم!"

اقبال کا ارادہ اب رخصت ہونے کا تھا کہ ثریّا نے کہا:

باب ۵

محبّت کی بے تابیاں

ثرّیا اقبال کا بہت لحاظ کرتی تھی۔ اس کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی تھی۔ اسے ملول دیکھتی تو خود مغموم ہو جاتی۔ اسے خوش دیکھتی تو خود بھی وفورِ مسرّت سے بے قابو ہو جاتی۔ لیکن رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ وہ اقبال سے بے تکلّف نہیں تھی۔ حالانکہ اس کا خیال بہت رکھتی تھی۔ یہی کیفیت اقبال کی تھی۔ وہ بھی ثرّیا کا بہت مان رکھتا تھا۔ اس کا حد سے زیادہ احترام کرتا تھا۔ اس کے اشاروں پر چلتا تھا لیکن کیا مجال کہ حدِّ ادب سے تجاوز کر جائے۔ وہ اس حقیقت کو اپنے ذہن سے کبھی محو نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ اس گھر کا نمک پروردہ ہے۔ نواب صاحب کے اس پر احسانات ہیں۔ جن کا بدلہ وہ اپنی جان قربان کر کے بھی نہیں ادا کر سکتا اور ثرّیا اس کی محسن زادی ہے۔ خود بھی اس کی محسن ہے۔

اقبال ہاکی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ آج کالج سے بالا بالا ایک میچ میں شرکت کے لیے چلا گیا۔ شام کی چائے بالعموم ثرّیا اور اقبال ساتھ ساتھ پیتے تھے۔ کافی دیر ہو گئی اور اب تک وہ خلافِ معمول نہیں آیا۔ ثرّیا بھی سوچ رہی تھی۔ اس وقت وہ اپنے کمرہ کی اُس کھڑکی کے قریب

"آپ کی کامیابی پر اگر میں کوئی تحفہ نذر کروں تو؟"

اقبال پھر چونکا:

"جی!"

"تو آپ کو کوئی عذر تو نہ ہوگا؟"

قبل اس کے کہ اقبال کوئی جواب دے، ثریا نے بڑھ کر، اس کی اُنگلی میں ایک قیمتی انگوٹھی پہنا دی اور بادِ بہار کی طرح نکلی، چلی گئی، اور اقبال ہکا بکا اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا!

کھڑی تھی۔ جہاں سے باہر کی رہگذر صاف نظر آتی تھی۔ لیکن اُس وقت، یہ رہگذر سنسان پڑی ہوئی تھی۔ بہت سے راہی آجا رہے تھے، لیکن وہ جس کے انتظار میں تھی اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اسی اثنا میں ملازمہ آئی۔ اس نے ایک چھوٹی سی میز پہ چائے کی ٹرے لاکر رکھ دی اور کھڑی ہوگئی کہ ثریّا آکر چائے پیئے۔ ثریّا نے اس سے کہا:

"ہم پی لیں گے تم جاؤ!"

وہ خاموشی سے چلی گئی۔ ثریّا کبھی کرسی پہ بیٹھ جاتی کبھی ٹہلنے لگتی۔ کبھی کھڑکی کے قریب جاکر کھڑی ہو جاتی اور رہگذر کی طرف تکنے لگتی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ بڑی دیر ہوگئی۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر ملازمہ آئی۔ وہ حیرت سے بولی:

"چائے تو ٹھنڈی ہوگئی!"

ثریّا نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا:

"پھر؟"

ملازمہ خاموش کھڑی ہوگئی۔ ثریّا نے کچھ دیر کے بعد کہا:

"واپس لے جاؤ!"

ملازمہ نے التجا کے لہجہ میں کہا:

"گرم کر لاؤں؟"

وہ تلخ لہجہ میں بولی:

"نہیں"

وفاداری کے جذبہ سے سرشار ہو کر اس نے کہا:

"نئی چائے ابھی بنا لاتی ہوں!"

"کوئی ضرورت نہیں! —— لے جاؤ، بک بک نہ کرو!"

اُس نے خاموشی سے ٹرے اُٹھالی اور چلی۔ ثریّا پھر رہگذر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا، اقبال سائیکل پر آ رہا ہے۔ ملازمہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ ثریّا نے آواز دی:

"سُنتی ہے!"

وہ پلٹ آئی:

"جی سرکار۔"

"چائے گرم کر کے لے آؤ!"

وہ حیرت سے اُسے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا ہو گیا ہے صاحبزادی کو؟ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔ پہلے ان کی طبیعت کتنی اچھی تھی۔ اب تو دن بہ دن چڑچڑی ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ اتنے میں اقبال آ گیا۔ ثریا بدستور اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس نے کہا:

"کہاں رہ گئے تھے آج؟"

اقبال نے کہا:

"آج ہاکی کا میچ تھا وہاں چلا گیا تھا"

"کھیلے بھی تھے؟"

" جی ہاں ! "

" نتیجہ کیا رہا ؟ "

" میری جیت ! "

وہ زور سے ہنسا۔ ثریا بھی مسکرا دی۔ اتنے میں ملازمہ آئی، اور چائے رکھ کر باہر چلی گئی۔ اقبال نے کہا :

" ارے آپ نے چائے ابھی نہیں پی ؟ "

" جی نہیں ! "

" مجھے تو آج میچ کی وجہ سے دیر —— "

" میں بھی زبیدہ کے ساتھ خالہ کے ہاں چلی گئی تھی۔ ابھی آ کر بیٹھی تھی کہ آپ آ گئے۔ مجھے بھی آج بہت دیر ہو گئی ! "

بات بن گئی۔ دونوں ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ ثریا نے کہا

" تو آپ جیت گئے ؟ "

اقبال نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا :

" زندگی کی کسی بازی میں آج تک تو ہار ہوئی نہیں مجھے ! "

" ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ لیکن ہار کو بھی بُرا نہ سمجھنا چاہیے ! "

اقبال نے متحیّر ہو کر پوچھا :

" کیا مطلب ؟ "

" کبھی کبھی وہ جیت سے بھی اچھی رہتی ہے ! "

اقبال پھر ہنسنے لگا۔ اس نے کہا :

"بالکل یہی بات آج ہاری ہوئی ٹیم کے کیپٹن نے بھی کہی تھی !"

"اور آپ ہنس دیے تھے ؟"

اقبال جھینپ گیا۔

اور محفل برخاست ہو گئی !

باب ۶

تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

ثریا اپنے تئیں بہت لیے دیے رہتی تھی۔ اس نے اقبال کے سامنے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اقبال تو اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ وہ چاہا جا سکتا ہے۔ وہ اس کی دلداری کرتا تھا ایک خادم اور نیاز مند کی حیثیت سے۔ وہ اس کی پرستش کرتی تھی، بالکل اجنبیت کے ساتھ۔ عنبریں کہ۔ لیکن چنچل زبیدہ سب کچھ سمجھتی تھی۔ وہ بڑی شریر تھی۔ ہنسی ہنسی میں بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ وہ بڑی ذہین تھی۔ باتوں باتوں میں اشارے کرتی رہتی تھی۔

ایک روز ثریا اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی ایک رومال کاڑھ رہی تھی۔ اس وقت وہ بہت خوش تھی۔ آہستہ آہستہ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ اتنے میں زبیدہ آئی۔ ثریا نے وہ رومال چھپا لیا۔ زبیدہ جم کر بیٹھ گئی۔

”میں آپ کے مشاغل میں خارج تو نہیں ہوئی نواب زادی صاحبہ؟“ ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا:

"زیادہ نہ اٹھلایا کرو!"

"کیوں؟ خفا ہو کچھ؟"

"ہاں بہت!"

"اے میں قربان، وجہ؟ سبب؟"

ثریّا مسکرا دی، زبیدہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ ثریّا نے کہا:

"تم یہیں بیٹھو، میں ابھی آئی؟"

"کہاں چلیں؟"

"کہیں نہیں ابھی آئی!"

"اور نہ آئیں تو؟"

ثریّا جواب دیے بغیر چلی گئی اور سیدھی تیر کی طرح، اقبال کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ اس وقت کہیں باہر جا رہا تھا۔ ثریّا کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ ثریّا نے پوچھا:

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"ذرا یونہی باہر تک!"

"آپ کو کڑھے ہوئے رومال پسند ہیں؟"

"جی مجھے؟"

"ہاں آپ کو! —— کل آپ زبیدہ سے کہہ تو رہے تھے!"

اقبال نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا:

اُنھوں نے پوچھا، میں نے کہہ دیا۔

"اچھا کیا کہہ دیا میں کب اعتراض کرتی ہوں یہ لیجیے!"

ثریّا نے نہایت حسین و خوشنما دو رومال اقبال کی طرف بڑھائے۔ اقبال نے ذرا رُکتے ہوئے کہا:

"یہ رومال؟"

"ہاں ہاں تو کیا ہُوا۔ ہاتھ بڑھائیے، قبول کر لیجیے!"

اقبال نے ہاتھ بڑھا کر دونوں رومال لے لیے۔ دروازے سے دو تیز اور شریر آنکھیں ان دونوں کی نگرانی کر رہی تھیں۔ یہ زبیدہ تھی۔ اقبال نے اُلٹ پلٹ کر رومالوں کو دیکھا۔ بہت اچھے تھے۔ اس نے کہا:

"بہت اچھے کڑھے ہوئے ہیں!"

"پسند آئے آپ کو؟"

"جی ہاں بہت۔"

"تو رکھ لیجیے!"

اقبال نے تامّل کرتے ہوئے، انھیں رکھ لیا اور پوچھا:

"یہ آپ نے کاڑھے ہیں؟"

"جی نہیں، ہمارے پڑوس میں ایک غریب سیّدانی رہتی ہیں۔ بڑی نیک، خود دار اور شریف، وہ اسی طرح اپنا گزارہ کرتی ہیں، سلائی اور کڑھائی کر کے وہی لائی تھیں۔ میں نے لے لیے۔ سوچا ان کا بھلا ہو جائے گا۔ آپ کی خوشی پوری ہو جائے گی۔ اب آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ رکھ لیجیے۔ میں ان سے کہہ دوں گی اور بھی بہت سے کاڑھ لائیں گی؟"

اقبال نے جھجکتے ہوئے کہا:

"بس بہت ہیں!"

ثریا بولی:

"آپ مجھے نیک کام سے منع کرتے ہیں؟"

"نہیں تو!"

"کہہ تو رہی ہوں، بیچاری سیّدانی غریب ہیں، اسی پہ ان کی روزی کا مدار ہے۔ میں نے سوچا ہے، جب تک وہ لائیں گی لیتی رہوں گی۔"

"لیکن اتنے سارے ہوں گے کیا؟"

"کچھ آپ رکھ لیجیے گا، کچھ میں، کچھ امّی جان کو دے دوں گی۔ کچھ ابّا حضور کو۔ زبیدہ بھی نہیں ماننے کی۔ دو چار وہ بھی چھین جھپٹ لے گی۔"

زبیدہ کا نام سن کر اقبال مسکرا دیا۔ ثرّیا نے پوچھا:

"کیوں آپ مسکرائے کیوں؟"

"زبیدہ پر"

ثرّیا بھی مسکرا دی۔

"ہاں بڑی شریر ہے، لیکن بڑی صاف دل۔"

وہ مسکراتا ہوا بولا:

"صاف دلی کا تجربہ آپ کو ہوگا، شرارت کا مجھے ہے!"

"کیا ہوا؟"

"کل میں ٹائی باندھ رہا تھا۔ ادھر سے گزریں۔ کہنے لگیں ہائے ہائے،

آپ خودکشی کیوں کیے لیتے ہیں؟"

ثریّا نے ہنستے ہوئے کہا:

"ہاں وہ ایسی ہی ہے آپ بُرا نہ مان جائیے گا۔"

"نہیں میں جانتا ہوں۔"

اقبال باہر چلا گیا۔ ثریّا اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس سے پہلے زبیدہ پھر اپنی جگہ پہنچ چکی تھی اور بالکل انجان بنی بیٹھی تھی۔ گویا اس نے ثریّا اور اقبال کی ایک بات بھی نہیں سُنی۔ زبیدہ نے شکایت کے لہجہ میں کہا:

"ہمیں اکیلا چھوڑ کر کہاں گئی تھیں؟"

"کہیں نہیں! ذرا اقبال کے کمرہ تک!"

"وہاں کیا کام تھا؟"

"تجھے کیا؟ تو اپنا کام کر پگلی!"

"اے ہاں وہ میرا رومال کیا ہُوا؟"

"کون سا رومال؟"

"اب اتنی بھولی بنتی ہو، وہی جو کل لیا تھا؟"

"مجھے نہیں یاد!"

"میں نہیں چھوڑنے کی، میرا اِتنا اچھا رومال، بڑی آئیں کہیں کی!"

"ایک نہیں دو دے دوں گی۔ اب تو ہوئی خوش!"

زبیدہ نے اٹھلا کر بچوں کی طرح کہا:

"نہیں میں تو وہی لوں گی!"

"واہ ری ضد، نہیں دیتے۔ جاؤ کر لو جو تمھارا جی چاہے!"

زبیدہ بولی:

"اچھی زبردستی ہے۔ پہلے تو یہ کہہ دیا کہ بڑا اچھا کڑھا ہے۔ میں خود بھی ایسا کاڑھوں گی۔ پھر دے دوں گی۔ اور اب یہ دھاندھلی! میں نہیں جانتی، لاؤ میرا رومال! نہیں تو میں کہتی ہوں اقبال سے جا کر!"

"کیا کہو گی؟"

"کہوں گی یہ چوٹٹی ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا!"

"وہ میرا کیا کر لیں گے؟"

زبیدہ نے ایک دم اُچھل کر کہا:

"اے ہے یہ تمھیں کیا ہُوا؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"میری تو یہ، تمھیں نہیں، تمھارے دل کو۔"

"کچھ پاگل ہوئی ہے؟"

"سچ! دھک دھک کر رہا ہے۔ یہاں تک آواز آ رہی ہے!"

"بالکل جھوٹ!"

زبیدہ نے اپنا کان اس کے دل پر لگا دیا اور کہا:

"سُن لو کتنے زور سے دھک دھکا رہا ہے!"

"چل ہٹ!"

بڑے اطمینان سے زبیدہ بولی:

"گھبراؤ نہیں۔ روگ کا علاج ہو جائے گا۔ ڈاکٹر گھر ہی میں ہے!"

ثریّا جھینپ سی گئی۔ اتنے میں اقبال ادھر سے گزرتا دکھائی دیا۔ زبی نے آواز دی:

ذرا سنیئے تو!"

" اقبال اندر آ گیا:

"کچھ مجھ سے کہہ رہی تھیں آپ؟"

"جی ہاں!"

"فرمائیے!"

"توبہ میرے اللہ کہتی ہوں۔ ذرا سانس تو لینے دیجیے!"

اقبال خاموش ہو گیا۔ زبیدہ پھر بولی:

"مسافرانہ طور پر کیوں کھڑے ہیں۔ بیٹھ جائیے۔ کرسی میں کھٹمل نہیں ہ

ثریا مسکرا دی۔ اقبال خفیف سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ زبیدہ گھنٹی بجائی۔ فوراً ایک خادمہ آموجود ہوئی۔ اس نے ثریّا سے زیادہ ٹھاٹھ سے حکم دیا:

"چائے!"

وہ چائے لینے چلی گئی، اور زبیدہ نے پھر اقبال کو تختۂ مشق بنایا:

"ارے ہاں یہ تو بتائیے۔ آپ سچ مچ کے ڈاکٹر ہیں یا یونہی؟"

اقبال نے ہنستے ہوئے کہا:

"یونہی کیا۔ یونہی بھی کوئی ڈاکٹر ہوا کرتا ہے؟"

"آپ مریض کو دیکھ کر مرض پہچان لیتے ہیں؟"

"بیشک!"

"بتائیے میں کیا بیمار ہوں؟"

"راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

زبیدہ نے عارفانہ انداز میں سر ہلا کر کہا:

"حال تو آپ نے ٹھیک بتایا۔"

"شکریہ!"

"لیکن میرا نہیں ثریا کا، شب بیدار تو یہ ہیں؟"

ثریا کلبلا کر خاموش ہو گئی۔ اقبال نے زبیدہ کو چھیڑتے ہوئے کہا:

"تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ بیمار ہیں!"

زبیدہ نے کہا:

"جی ہاں بیمار، اور بنصیبِ دشمناں بہت بیمار۔ جب دیکھیے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے....."

اقبال نے بات کاٹ کر کہا:

"کچھ آگے بھی کہیے گا؟"

زبیدہ نے بات پوری کی:

"ان کا دل دھک دھک کیا کرتا ہے!"

ثریا نے زبیدہ کو ٹوکا:

"کچھ دماغ چل گیا ہے؟"

وہ بولی:

"لے تم چپکی بیٹھی رہو، ہمیں حال کہنے دو۔ تو ہاں ڈاکٹر صاحب ذرا ان کا معائنہ کیجیے!"

اقبال بھی اس وقت مزے میں تھا اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"بلا معائنہ کیے، میں سب کچھ بتا سکتا ہوں!"

"بتائیے؟"

"نبض تیز چل رہی ہے۔ کچھ حدّت ہے مزاج میں!"

زبیدہ نے خوش ہو کر کہا

"اب آئے آپ راہ پر۔ بالکل ٹھیک۔ آپ حدّت کہتے ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ یہ تو جلی بھسم ہوئی جا رہی ہے، کسی آگ میں!"

اقبال نے اپنی تشخیص کا سلسلہ جاری رکھا:

"آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کچھ خون کی بھی کمی ہے!"

زبیدہ:

"کمی؟ خون ہے کہاں، وہ تو کب کا سوکھ گیا!"

اقبال،

"اور زبان ....."

زبیدہ نے پھر بات کاٹی:

"زبان دیکھ کر غریب کی کیا کیجیے گا، زبان تو اس کی بند ہے۔ تالا پڑا ہوا ہے اس پر۔ نہ سر سے کھیلے، نہ منہ سے بولے، میری لیے زبان بہن!"

ثریّا نے اقبال سے کہا:

"یہ زبیدہ تو ہے پاگل، نہ جانے اناپ شناپ بکا کرتی ہے۔ آپ بی کس کی باتوں میں آ گئے!"

اتنے میں ملازمہ چائے لے کر آ گئی۔ زبیدہ نے ٹرے اپنے سامنے کھسکائی اور چائے بنانے لگی!

باب ۷

رُخصتِ ہوش

مردانہ نشست گاہ میں بیٹھے نواب صاحب ایک مصاحب سے چوسر کھیل رہے تھے۔ آج وہ لگاتار ہار رہے تھے۔ کئی بازیاں جب ہارے تو جھنجھلا کر کہنے لگے:

"آج جیت تک تمھیں ہرا نہ لوں اُٹھوں گا نہیں۔ چاہے ایک ہفتہ گذر جائے!"

اس اعلانِ جنگ کے باوجود، وہ پھر ہارے مصاحب نے پوچھا:

"کیوں حضور اور بچھے گی؟"

نواب صاحب نے فرمایا:

"ضرور بچھے گی۔ ایک نہیں ہزار!"

کھیل پھر شروع ہو گیا، اور عین اس وقت جب نواب صاحب کے جیتنے کی شکل پیدا ہو رہی تھی کہ ملازم آیا اور اس نے کہا:

"علاقہ سے چودھری امجد علی تشریف لائے ہیں!"

نواب صاحب اپنے کام میں مشغول رہے، اور فرمایا:

"آنے دو!"

چودھری امجد علی؛ نواب صاحب کے دیرینہ کار اور وفادار ملازم تھے۔ دیہاتی علاقے کا انتظام و انصرام انہی کے سپرد تھا۔ ان کی دیانت و شرافت پر نواب صاحب کو بہت بھروسہ تھا۔ سارا کام انہی پر چھوڑ رکھا تھا۔ چودھری امجد علی اندر تشریف لائے اور جھک جھک کے تسلیمات اور کورنش بجا لائے۔ اس وقت ان کے چہرے سے بہت پریشانی اور اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ نواب صاحب نے نظر اُٹھا کر اُنھیں دیکھا۔ ان کی کیفیت کا اندازہ کر لیا اور شفقت و عنایت کے لہجہ میں پوچھا:

"کہیئے کیسے آنا ہوا؟ آپ پریشان سے کیوں نظر آتے ہیں؟"

چودھری امجد علی نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا:

"حضور کا اقبال دونا ہو۔ خضر کی عمر پائیں آپ۔ جمال پور میں طاعون پھوٹ پڑا ہے سرکار۔ بوڑھے، جوان، مرد، عورت، بچے سب موت کے گھاٹ اُتر رہے ہیں، اُترے چلے جا رہے ہیں، میرے حضور۔ رعیت بستی چھوڑ کر قبرستان آباد کر رہی ہے۔ اگر روک تھام نہ ہوئی تو اُجڑ جائے گا سارا گاؤں!"

نواب صاحب چودھری کی باتیں سُن کر گھبرا گئے۔

اقبال بھی ابھی آکر بیٹھا تھا۔ اس سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا:

"حالات کا فوری تدارک ضروری ہے!"

اقبال نے مودّبانہ لہجہ میں عرض کیا:

"بیشک!"

"جلد کوئی انتظام کرو!"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں خود جاؤں!"

نواب صاحب چونک پڑے،

"تم؟"

"جی میں!"

"تم جمال پور جاؤ گے؟ اس بھڑکتی آگ میں کود پڑو گے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں جانے دوں گا تمہیں!"

اقبال نے آج پہلی مرتبہ نواب صاحب کو جواب دیا، اور عرض کیا:

"جمال پور میں موت کا بازار گرم ہے، میں نے ڈاکٹری اسی لیے پڑھی ہے کہ جہاں تک ہو سکے، مرتے ہوؤں کو موت سے بچاؤں۔ جانتا ہوں آپ مجھ خادم کو کتنا عزیز رکھتے ہیں لیکن اپنی غریب اور وفادار رعایا سے کتنا پیار کرتے ہیں آپ؟ یہ بھی جانتا ہوں۔ اجازت مرحمت فرمائیے۔ میں جاؤں گا، خود بیماروں کا علاج کروں گا۔ ان کی تیمارداری کروں گا!"

"لیکن شہر میں بہت سے ڈاکٹر ہیں، حکیم ہیں، وید ہیں۔ یہ سب کس مرض کی دوا ہیں؟"

مصاحب نے کہا:

"ہاں میاں صاحبزادے، اپنی جان کیوں جوکھوں میں ڈالتے ہو؟ بھیج دو دو چار ڈاکٹروں اور چند حکیموں کو!"

نواب صاحب نے ارشاد فرمایا:

"میں بڑی سے بڑی فیس دینے کو تیار ہوں۔ زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر آمادہ ہوں!"

اقبال نے کہا:

"بجا ارشاد ہُوا، لیکن میں جانتا ہوں، کوئی ڈاکٹر وہاں نہیں جائے گا۔ اور اگر گیا، تو جی لگا کر کام نہیں کرے گا۔ وہ فیس کے لالچ سے جائے گا۔ میں خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے خدمت کا موقع مرحمت فرمائیے۔ یہ جذبہ آپ کے زیرِ سایہ رہ کر مجھ میں پیدا ہُوا ہے!"

مصاحب نے پھر مداخلت کی:

"نہیں بیٹے نہیں!"

نواب صاحب کی آواز گونجی:

"تم جاسکتے ہو اقبال! ـــــ میرے دل میں تمھاری عزّت اور محبّت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ دُکھیاروں کے کام آیا جائے۔ مجھے خوشی ہے اور فخر بھی کہ میری تربیّت بے نتیجہ نہیں رہی۔ تم نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا۔ شاباش، خدا حافظ!"

مصاحب نے کہا:

"جزاک اللہ، ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند، کیا ہمت ہے کیا ولولہ ہے۔ بخدا جی چاہتا ہے، میں بھی تمھارے ساتھ چل پڑوں۔ جاؤ سدھارو۔ خدا تمھیں کامیاب و کامران واپس لائے!"

اقبال باہر سے اُٹھ کر اندر آیا۔ راستہ میں زبیدہ اور ثریّا ملیں۔ ان کی

حرکات و سکنات سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں علم ہو چکا ہے۔ اقبال اتنی خطرناک منزل کی طرف جا رہا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ اس کے کمرہ میں آ گئیں۔ وہ سوٹ کیس میں جلدی جلدی سامان رکھنے لگا۔ ثریّا نے ایک سوگوار تبسّم کے ساتھ کہا :

" آخر سفر کی ٹھان لی آپ نے ؟ "

اقبال نے ایک تاثر کے عالم میں کہا :

" فرض کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مجھے جانا ہی پڑے گا ! "

زبیدہ سے بھلا کیوں خاموش رہا جاتا ؟ وہ بولی :

" بڑے آئے ہیں ڈاکٹر بن کر ؟ "

اقبال نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرانے لگا :

" کیوں شبہ ہے آپ کو میرے ڈاکٹر ہونے میں ؟ "

زبیدہ بولی :

" خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے یہاں اپنے کچھ جوہر دکھاتے۔ پھر باہر جا کر جھنڈے گاڑتے تو ایک بات تھی۔ "

" یہاں خدانخواستہ کون بیمار ہے ؟ "

وہ شرارت بھری سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوئی :

" کوئی نہیں ـــــ ابھی کل ہی بتا چکی ہوں۔ ثریّا کو دل کا مرض ہے۔ بڑے ڈاکٹر ہیں تو ان کا علاج کیجیے ! "

اقبال نے مسکرا کر کہا :

"ان کی دیکھ بھال کے لیے آپ کافی ہیں!"

"ہونہہ آپ کافی ہیں ــــــ حالانکہ خود مسیحا بنے پھرتے ہیں۔"

ثریّا نے زبیدہ کو جھڑکا:

"پھر وہی باتیں!"

"تو غلط کہہ رہی ہوں کچھ؟"

"چپ رہو زبیدہ ہر وقت مذاق اچھّا نہیں لگتا۔"

"میری موجودگی اگر کھل رہی ہے تو میں جاتی ہوں، یہ چلی!"

اور واقعی وہ کمرہ سے باہر نکل چلی گئی۔ ثریّا نے اسے نہیں روکا۔ وہ اس وقت بہت پریشان تھی۔ لیکن ضبط کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کا رواں رواں رو رہا تھا۔ لیکن غیر معمولی قوتِ برداشت سے کام لے کر وہ اپنے آپ کو چھپائے ہوئے تھی۔ اپنا باطن ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ اقبال بدستور سامانِ سفر باندھ رہا تھا۔ ثریّا نے کہا:

"زبیدہ ٹھیک تو کہہ رہی تھی!"

اقبال نے سوٹ کیس پر ہاتھ رکھے رکھے ثریّا کی طرف دیکھا اور کہا:

"آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں؟"

"اور کیا! ــــ خطرہ میں کودنا کون سی عقلمندی ہے؟"

"لیکن نہ کودنا بزدلی ہے!"

"بزدلی کی اس میں کیا بات ہے؟ احتیاط کرنی ہی چاہیئے!"

"ٹھیک ہے، احتیاط کا جہاں تک تعلق ہے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھوں گا لیکن جب انسانیت موت کی ہچکیاں لے رہی ہو۔ بوڑھے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہوں، جوان سسک سسک کر جان دے رہے ہوں۔ بچے بلک بلک کر ماں کی گود سے جدا ہو رہے ہوں۔ میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کروں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ ایسی زندگی سے ہزار بار موت اچھی!"

"میں آپ کو روکتی نہیں۔ سچ پوچھیے، تو مجھے آپ کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔ انسان وہی ہے جو انسانیت کے کام آئے۔ بس ذرا یہ خیال تھا کہ وہاں آگ بھڑک رہی ہے اور جب آگ بھڑکتی ہے تو کسی کو نہیں دیکھتی!"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ لیکن خدا بھی تو کوئی چیز ہے۔ مجھے تو اُسی پر بھروسہ ہے!"

اقبال کا مختصر سا سامانِ سفر تیار ہو چکا تھا۔ ثریا نے کہا:

"جائیے خدا حافظ!"

وہ آگے بڑھا۔ دروازہ پر بیگم صاحبہ موجود تھیں۔ اُنھوں نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے گلے سے لگایا، دعائیں دیں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"جس طرح پیٹھ دکھا کر جاتے ہو۔ اسی طرح خدا منہ دکھانا نصیب کرے۔ جاؤ! خدا تمھارا حامی و ناصر ہو!"

باہر آیا تو نواب صاحب استقبال کے لیے موجود تھے۔ اُنھوں نے بھی دعائیں دے کر رخصت کیا، اور کہا:

"مجھے اُمید ہے تم سرخرو ہو کر واپس آؤ گے!"

اقبال چودھری امجد علی کے ساتھ جمال پور روانہ ہوگیا۔ اوپر کوٹھے پر ثریّا اپنے کمرہ کی کھڑکی سے اقبال کی روانگی کا یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ ٹکٹکی لگائے وہ اس کی طرف دیکھتی رہی اور جب وہ نظروں کی حد سے دُور نکل گیا تو آنکھیں ضبط نہ کر سکیں۔ اُبل پڑیں۔ اب تک وہ برابر ضبطِ فغاں سے کام لے رہی تھی۔ لیکن اب بے قابو ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنسو پونچھے اور کمرہ سے باہر نکل آئی۔ آج یہ گھر اسے کتنا سنسان اور ویران نظر آ رہا تھا۔

زبیدہ ثریّا کی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر، اس وقت ثریّا کے پاس نہیں آئی۔ اس نے سوچا۔ ثریّا حساس لڑکی ہے۔ اقبال کے یوں چلے جانے سے اسے غیر معمولی صدمہ پہنچا ہے۔ اس وقت نہ وہ ہنسی مذاق کی متحمل ہو سکتی ہے، نہ دلجوئی اور دلداری کی۔ بہتر یہی ہے کہ تھوڑی دیر اس سے دور رہا جائے۔ اس نے باحالِ پریشاں اور چشمِ پُرنم، ثریّا کو کمرہ سے نکلتے دیکھا۔ لیکن خود کترا گئی۔ وہ اس کے جانے کے بعد زیرِ لب گنگنانے لگی ؎

فائدہ کیا ہے تجھے بزم میں جل جانے سے
شمع نے یہ بھی نہ پوچھا کبھی پروانے سے

باب ۸

پہلے پہل

چودھری امجد علی کے ساتھ اقبال جمال پور پہنچا، اور یہاں کے حالات دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا۔ کتنا اور شاداب تھا یہ گاؤں۔ یہاں کے لوگ کتنے "اچھے" تھے۔ یہاں کا موسم ک خوشگوار تھا؟ یہاں کے باغ اور باغیچے، نہر اور دریا کتنے رواں آفر تھے۔ لیکن اب سب پہ اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں کے چہرے اُدا گھروں پہ ویرانی اور بربادی کا نشان، کھیت خاموش اور سنسان، "بچے" م اور سنجیدہ، جانور مجسّم فریاد خاموش۔ نہ کوئی رکھوالی کرنے والا تھا، نہ چارہ والا، نہ دُور چرائی کے لیے لے جانے والا۔

یہ عالم دیکھ کر اقبال نے چودھری صاحب سے کہا:

"یہاں کی تو دُنیا بدلی ہوئی نظر آتی ہے!"

"ہاں بیٹے یہی حال ہے! —— کون گھر ہے جہاں سے دو ایک لا نہ اُٹھی ہوں؟ کون گھر ہے، جہاں دو ایک ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت س نہ کر رہے ہوں؟ معمولی بیماری کا علاج تو گاؤں والے خود کر لیتے ہیں طاعون کی گلٹی دیکھ کر سہم جاتے ہیں اور نڈھال ہو کر خود کو اللہ کے

کر دیتے ہیں۔ کیا کریں بیچارے؟"

"سچ فرمایا آپ نے!"

"اب تم آئے ہو تو اُمید بندھی ہے!"

"میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔ اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔"

"خدا تمھیں سلامت رکھے۔ جیو۔ کتنے نیک اور شریف ہو تم!"

اقبال نے چودھری صاحب کے ساتھ سب سے پہلے تو پورے گاؤں کا چکّر لگایا۔ بیماروں کو دلاسا دیا اور مرنے والوں کے پسماندگان کو صبر کی تلقین کی۔ پھر اس نے نواب صاحب کی خوبصورت اور وسیع کوٹھی کو —— جہاں وہ کبھی کبھی سیر و شکار کے لیے چند روز آ کر ٹھہرا کرتے تھے —— اپنا ہسپتال بنا لیا۔ تمام مریضوں کو وہیں جمع کر لیا۔ بہت سی دوائیں اور انجکشن ٹیوب اپنے ساتھ لایا تھا۔ مریضوں کو ادھر لاتے ہی ان کے علاج اور تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ چودھری صاحب اسے اپنے ہاں ٹھہرانا چاہتے تھے۔ لیکن اس نے یہی مناسب سمجھا کہ مریضوں سے کسی وقت بھی دُور نہ رہے، لہٰذا اپنے ہسپتال کا ایک کمرہ اس نے رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

پہلے ۲۴ گھنٹے اقبال پر بڑے کٹھن گزرے۔ اسے پل بھر کے لیے بھی آرام نہیں ملا۔ آستینیں چڑھی ہوئی۔ بال بکھرے ہُوئے، پسینہ میں شرابور، وہ خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف تھا۔ ایک وسیع کمرے میں بے شمار لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ کوئی چارپائی پر، کوئی بنچ پر، کوئی زمین پر، کوئی

بے ہوش تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ کسی کے عزیز رو رہے تھے۔ اقبال ان سب کو تسلّی بھی دیتا جاتا تھا۔ اپنا کام بھی کیے جاتا تھا۔ انجکشنوں کی خالی ٹکیوں کا انبار اس کے سامنے لگا تھا۔ وہ تھک تھک کے چُور ہو گیا تھا۔ یہ ۲۴ گھنٹے اس طرح گزرے تھے کہ نہ اس کے مُنہ میں پانی کا ایک قطرہ گیا تھا، نہ کھانے کا ایک لقمہ۔ آرام کا ایک لمحہ بھی اسے میسّر نہ آیا تھا۔ وہ خاموشی اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہُوا تھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر، ایک مریض سے، جس کی حالت اب نسبتہً بہتر تھی۔ نہ رہا گیا۔ اس نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب؟"

اقبال نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا:

"ہاں بھئی کیا کہتے ہو؟ درد ہے کہیں؟"

وہ کمزور آواز میں بولا:

"نہیں! ــــــ مَیں کہتا ہوں، اتنی دیر ہو گئی آپ کو کام کرتے۔ پَل بھر بھی تو آپ نے آرام نہیں لیا۔ کہیں خدانخواستہ آپ بھی بیمار نہ پڑ جائیں!"

وہ مسکرایا:

"تم فکر نہ کرو۔ مَیں بڑا سخت جان ہوں!"

"کچھ دیر تو آرام کر لیجیے!"

"یہ ایک مریض اور باقی ہے۔ اس کے انجکشن لگا لوں تو کچھ دیر کے لیے

سو رہوں جا کر!"

آخری مریض سے فارغ ہو کر، وہ اپنے کمرہ کی طرف چلا کہ ذرا دیر سستا لے۔ اتنے میں ایک دردناک آواز اس کے کان میں آئی۔

"ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب!"

وہ جاتے جاتے رُک گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ تو شباب و رعنائی اور حسن و جمال کی ایک مورت، سراپا درد بنی سامنے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر اس نے اپنے مُنہ پر پلّو ڈال لیا۔ اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اقبال نے نرمی اور ملاطفت کے ساتھ کہا:

"کیا ہے؟ تم کون ہو؟"

وہ سسکی لیتی ہوئی بولی،

"خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔ بابا کے گلٹی نکل آئی۔ دم توڑ رہے ہیں وہ؟"

اس اجنبی دوشیزہ کی آہ و زاری سُن کر، اقبال سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ فوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے گھر پہنچا، تو معلوم ہُوا۔ یہ چودھری امجد علی کا گھر ہے۔ اور یہ ان کی اکلوتی لڑکی حمیدہ ہے۔ حمیدہ کو اس نے ایک آدھ دفعہ بچپن میں دیکھا تھا اور بھول بھی گیا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ وہ کیا سے کیا بن گئی ہے۔

چودھری صاحب نیم بے ہوش درد سے کراہ رہے تھے۔ ان کا یہ حالِ زار دیکھ کر حمیدہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اقبال بہت متاثر ہُوا۔ اس نے حمیدہ کو تسلّی دی۔

"آپ ذرا بھی نہ گھبرائیے۔ یہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ بہت معمولی اثر ہے!"

یہ کہہ کر وہ چودھری صاحب کی دیکھ بھال اور علاج میں لگ گیا۔ اس نے دو انجکشن دیے۔ ہوا اور روشنی کا انتظام کیا۔ پھر تیمارداری سے متعلق حمیدہ کو ضروری ہدایات دیں، اور بے ساختہ اس کے بہار اندر بہار مکھڑے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ شرما گئی۔ اس نے کہا:

"پاپا اچھے ہو جائیں گے؟"

"ضرور!"

"مرض کا حملہ زیادہ شدید تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں! لیکن ایک بات ——"

اور ایک بار پھر اس کی نظر خوبصورت حمیدہ کے چہرے پر پڑی اور وہ کھو سا گیا۔ وہ بولی:

"کچھ کہہ رہے تھے آپ؟"

وہ چونک پڑا۔ اٹک اٹک کر بولا:

"میں یہ کہہ رہا تھا گھبرانے کی بات نہیں، لیکن احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔"

حمیدہ خاموش رہی، وہ پھر بولا:

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔ صبح شام میں انھیں دیکھنے آتا رہوں گا لیکن اگر بیچ میں کسی وقت آپ میری ضرورت محسوس کریں، تو میں فوراً آجاؤں گا۔"

حمیدہ مدھم آواز میں بولی:

"آپ کی مہربانی کا شکریہ!"

اور اقبال خاموشی کے ساتھ باہر جانے کے لیے چلا۔ اس وقت اس پر از خود رفتگی کا عالم طاری تھا۔ وہ اپنا بیگ یہیں بھول گیا اور باہر کی طرف جانے کی بجائے اندر کمرہ کی طرف بڑھا۔ حمیدہ بیگ اُسے دیتی ہوئی بولی:

"راستہ ادھر ہے ڈاکٹر صاحب!"

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"اوہ میں کچھ کھو سا گیا تھا، شکریہ!"

وہ بیگ لے کر چلا گیا۔ لیکن اس کے الفاظ حمیدہ کے کان میں گونج رہے تھے۔ وہ زیرِ لب خود بخود بولی:

"کہہ رہے تھے میں کھو سا گیا تھا —— لیکن کیوں؟ کس چیز میں کھو گئے تھے؟"

خدا جانے اسے کیا خیال آیا۔ وہ جلدی سے اپنے باپ کے کمرہ میں گئی وہ آرام سے سو رہا تھا۔ نبض ٹھیک چل رہی تھی اور بخار بہت ہلکا تھا۔ اِدھر سے مطمئن ہو کر وہ پھر اپنے کمرہ میں آئی۔ سامنے آئینہ رکھا ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے آپ کا جائزہ لینے لگی۔ شاید وہ آئینہ سے پوچھ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مجھے دیکھ کر تو نہیں کھو گئے تھے؟ سچ سچ بتا کیا میں واقعی ایسی ہوں کہ مجھے دیکھ کر وہ کھو سے گئے؟ اپنے آپ کو بھول گئے؟ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ یہ سب کیا تھا؟

کیوں تھا؟ اسے کیا کہتے ہیں؟ —— محبت؟ ——— ہائے میر
اللہ، اب کیا ہوگا؟

وہ آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اور اپنے آپ میں محو تھی۔ کہ کسی کے کھکھارنے کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا، تو بدمعاش دلاور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یہ رشتے میں چودھری صاحب کا بھتیجا ہوتا تھا، اور گاؤں بھر کے لفنگوں اور اوباشوں کا سردار تھا۔ حمید نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی:

"کیا ہے؟ کیوں آئے ہو تم؟"

وہ ہنسنے لگا:

"حسن کی چھری کو سان پہ چڑھایا جا رہا ہے؟"

اور پھر گانے لگا: ع

ادا و ناز کو ظالم تری شمشیر کہتے ہیں

حمیدہ نے بگڑ کر کہا:

"یہ بیہودہ باتیں مجھے نہیں اچھی لگتیں۔ تم اکیلے دوکیلے میرے گھر میں کیوں آتے رہتے ہو؟ کہہ دوں گی بابا سے کسی دن تو ساری شیخی کرکری ہو جائے گی!"

دلاور نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا:

"کہہ دینا، کہہ دینا، یہاں کسی سے ڈرتے نہیں۔ وہ گاؤں کے چودھری ہیں تو ہم بھی اپنے ساتھیوں کے سردار ہیں۔ سمجھیں؟ ہاں!"

"معلوم ہے تیری سرداری، بدمعاشوں کا سردار بنا پھرتا ہے، موا لُچّا کہیں کا!

دلاور نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا:

"بھئیں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی اور یہ باتیں کہتا تو زبان کھینچ لیتا اس کی گُدّی سے ـــــ جوانی قسم!"

"چل چل، بڑا آیا ہے جوان بن کے، پرائی بہو بیٹیوں پر اپنی شیخی جتانے!"

اتنے میں چودھری کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے باپ کے کمرے کی طرف لپکی۔ دلاور بھی ساتھ ساتھ آیا۔ پوچھنے لگا:

"کیا ہُوا ابھئیں؟"

"طاعون ہو گیا ہے کل سے، گلٹی بھی نکلی ہے۔ ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے!"

طاعون کا لفظ سُن کر دلاور کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ ساری چوکڑی بھُول گیا۔ ابھی چند روز ہوئے اس کا باپ اسی میں مرا تھا۔ وہ بہت ڈرنے لگا تھا، اس بیماری سے۔ چپکے سے بغیر چودھری کو دیکھے بھالے وہ کھسک گیا۔

کوئی پندرہ دن کے بعد چودھری امجد علی نے غسلِ صحت کیا۔ یہ پندرہ دن اقبال نے آنکھوں میں کاٹے۔ اس کے وقت کا بڑا حصّہ گاؤں کے بیماروں کے علاج معالجہ میں صرف ہوتا تھا، اور جو بچتا تھا وہ چودھری صاحب کی تیمارداری میں۔ اسے اپنی صحت کی پروا نہیں تھی۔ وہ عیش و آرام کو، کھانے پینے کو بالکل بھول چکا تھا۔ صرف ایک فکر تھی اسے۔ کسی طرح گاؤں سے یہ وبا دُور ہو۔ کسی طرح چودھری صاحب پھر تندرست ہو جائیں۔ گاؤں کی حالت بھی اب پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی تھی اور چودھری صاحب تو بالکل چنگے ہو چکے تھے۔ صرف تھوڑی سی کمزوری باقی تھی۔

اقبال چودھری صاحب کی پٹّی سے لگا بیٹھا تھا۔ اتنے میں حمیدہ آئی۔ اقبال نے کہا:

"اب یہ بالکل تندرست ہیں۔ مرض کا کہیں نام و نشان بھی نہیں!"

حمیدہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے۔ شرمائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر بولی:

"کس زبان سے آپ کا شکریہ بجا لاؤں ڈاکٹر صاحب!"

"اوہو، اب آپ تکلّف پر اُتر آئیں؟ اس کی سند نہیں ہے جناب!"

حمیدہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی:

"آپ نے بابا کے ساتھ مجھے بھی ایک نئی زندگی بخش دی ہے!"

بھلا چودھری صاحب کیوں خاموش رہتے؟ اُنھوں نے کمزور اور مدھم آواز میں کہا:

"تمھارا بھلا ہو بیٹے! میری بن ماں کی بچّی کو تم نے یتیم ہونے سے بچا لیا!"

پھر چودھری نے پوچھا:

"گاؤں کا کیا حال ہے بیٹا؟"

اقبال نے جواب دیا:

"خدا کے فضل سے بہت اچھا ہے۔ صرف تین چار آدمی مرے، باقی اکثر تندرست ہو گئے۔ دو دن سے کوئی نیا کیس نہیں ہوا۔ چند آدمی ابھی بیمار ہیں۔ اُمّید ہے وہ بھی جلد اچھے ہو جائیں گے!"

"جیتے رہو بیٹے! خدا تمھیں ملک کا سب سے بڑا ڈاکٹر بنا دے۔"

اقبال ہنسنے لگا۔ حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا:

"آمین!"

تھوڑی دیر کے بعد، اقبال جانے کے لیے اُٹھا۔ حمیدہ اسے دروازے تک پہنچانے آئی۔ جاتے ہوئے اقبال نے کہا:

"مبارک ہو چودھری صاحب اب بالکل تندرست ہو گئے۔"

حمیدہ نے ممنون نگاہوں سے اُسے دیکھا، اور کہا:

"شکریہ!"

پھر ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔ اقبال اس کی ان قاتل نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے پُوچھا:

"کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟"

وہ بولی:

"فرشتہ اگر آدمی کا لباس پہن لے، تو کیسا لگتا ہے؟ یہی دیکھ رہی تھی!"

اقبال باہر چلا آیا۔ حمیدہ اندر چلی گئی۔ راستے بھر اقبال کے کان میں حمیدہ کے درد بھرے الفاظ گونجتے رہے۔ وہ پہلی نظر میں حمیدہ کو دل دے بیٹھا تھا۔ اور اب سوچ رہا تھا۔ کیا حمیدہ کا دل بھی میری طرف مائل ہے۔ کیا وہ بھی مجھے چاہتی ہے؟ کیا اس کے دل پر میں قبضہ کر سکتا ہوں۔ کیوں نہیں؟ وہ بھی غریب ہے۔ میں بھی غریب ہوں۔ لوگ جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ میں محل میں رہ کر جھونپڑے کے خواب دیکھتا ہوں۔ بےشک میری پرورش و پرداخت محل میں ہوئی۔ میں وہاں رہ سکتا ہوں۔ کھپ سکتا ہوں، لیکن میری محبت

جھونپڑے ہی میں پروان چڑھ سکتی ہے ؟ تو کیا حمیدہ مجھے مل جائے گی ؟ چودھری صاحب راضی ہو جائیں گے ؟ نواب صاحب اجازت دے دیں گے ؟ بیگم صاحبہ اس رشتے کو پسند کر لیں گی ؟ اور زبیدہ وہ کتنا چڑائے گی مجھے ؟ ثریا کہیں گی، بڑی چنچل ہے۔ اور ثریّا ؟ وہ بڑی شریف لڑکی ہے۔ سارے گھر میں سب سے زیادہ حمیدہ کی خاطر وہی کرے گی ؟ بالکل اپنے باپ پر پڑی ہے۔ وہی شرافت، وہی عالی ظرفی، وہی مروّت، وہی رحم !——

ہسپتال آگیا، اور وہ پھر مریضوں کے ہجوم اور انبوہ میں کھو گیا !

باب ۹

یادِ یار

اقبال کی جدائی نے ثریّا کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر کیا تھا۔ وہ شمع کی طرح خاموش تھی۔ لیکن شمع کی طرح جل رہی تھی۔ اس کی خاموشی سب دیکھتے تھے۔ لیکن اس کا جلنا اور گھلنا کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ سوا زبیدہ کے۔

زبیدہ ثریّا کی مزاج شناس تھی۔ وہ جانتی تھی، ثریّا بڑی ضدّی اور خود پسند لڑکی ہے۔ کسی کو آشنائے راز نہیں بنائے گی۔ کسی کے سامنے اقرارِ محبّت نہیں کرے گی۔ کسی طرح اپنی ہار نہیں مانے گی۔ گھُل گھُل کر مر جائے گی مگر لب نہ ہلائے گی۔ ناکام و نامراد قبر میں پہنچ جائے گی، مگر فریاد نہ کرے گی۔ جس کو چاہتی ہے، اُس کی چاہ میں جان دے دے گی۔ مگر آہ و فغاں کو اپنا ہمدم و ہمراز نہیں بنائے گی۔ جب وہ اقبال تک پہ اپنی محبّت افشا نہیں کرتی، تو کسی اور پر کیا کرے گی؟

ثریّا کا دل روتا تھا۔ سب ہنستے تھے۔ وہ گھر کی تمام سرگرمیوں میں حصّہ لیتی تھی۔ لیکن بجھے ہوئے دل سے۔ وہ اقبال کے خیریت نامے کے لیے بےقرار تھی۔ مگر کیا مجال کہ کبھی پوچھ لے۔ خط آیا؟ خبر آئی؟ زبیدہ اُس کا دل بہلانے کی، اُسے ہنسی مذاق میں اُلجھانے کی، اور باتوں باتوں میں

اس کا رازِ دل پا لینے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ مگر کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ طائرِ بلند بام کی طرح کبھی ہاتھ نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے راز کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اور اپنی خودداری پر کسی طرح بھی آنچ نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ وہ ثریّا تھی نواب دلاور جنگ کی لڑکی۔

ایک روز پھر زبیدہ نے ثریّا کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کہنے لگی:

"اچھی ایک بات پوچھیں بتاؤ گی؟"

ثریّا نے پورے طور پر متوجہ ہوتے ہوئے کہا:

"کیوں نہیں بتائیں گے؟ پوچھو!"

"سچ سچ بتانا؟"

"ہاں بالکل سچ سچ!"

"کسی کو چاہتی بھی ہو؟ کسی سے محبّت بھی ہے تمھیں؟"

ثریّا ہنس پڑی۔

"بس یہی اتنی سی بات؟"

"ہاں یہی! بتاؤ؟"

"کیوں نہیں چاہتی؟ چاہتی ہوں!"

زبیدہ نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا:

"تو نام بتاؤ، کسے؟"

ثریّا مسکرائی:

"میں حضور ابّا جان کو اتنا زیادہ چاہتی ہوں، اتنا زیادہ چاہتی ہوں کہ—"

زبیدہ نے بات کاٹی :

" ہاں معلوم ہے —— اچھّا اور بھی کسی کو چاہتی ہو ؟ "

" ہاں ہاں کیوں نہیں ، اماں جان کو بھی چاہتی ہوں ! "

" معلوم ہے ، ماں کو کون نہیں چاہتا ۔ اور بھی کوئی ہے جس سے محبّت ہو تمھیں ؟ "

ثریّا نے کچھ سوچ کر کہا :

" ہاں بھئی ہے ، ایک اور ہستی بھی ہے ! "

زبیدہ کو یقین ہو گیا ۔ اب اُگل دے گی ثریّا سب کچھ ۔ بڑے پیار سے بولی :

" شاباش ! کون ہے وہ ؟ "

ثریّا نے بڑی سنجیدگی سے کہا :

" تم ! "

زبیدہ بگڑی گئی :

" تو یہ بھئی پھر وہی مذاق ! "

" قسم لے لو جو میں جھوٹ کہتی ہوں ! "

ثریّا ہنسنے لگی ۔ زبیدہ چل گئی ۔ اس نے کہا :

" میں جاتی ہوں ! "

" ارے سُنو تو ! "

لیکن وہ چلی گئی ۔ ثریّا اپنی لائبریری میں پہنچی اور کتابیں دیکھنے لگی ۔ تھوڑی

دیر کے بعد زبیدہ پھر آئی۔ ڈاک آ چکی تھی۔ وہی ـــــ بہت سے اخبارات رسالے، کتابیں، بعض تاجران کتب کے خطوط۔ ثریّا نے اُلٹ پلٹ کر سب کو دیکھا، اور رکھ دیا۔ ان میں اقبال کا کوئی خط نہیں تھا۔ ثریّا کا جی چاہا۔ زبیدہ سے پوچھے۔ امّاں یا ابّا کے پاس کوئی خط جمال پور سے آیا ہے؟ لیکن اس جذبہ کو بھی اس نے دبا دیا۔ بالکل خاموش رہی۔ کچھ نہیں پوچھا۔ زبیدہ ثریّا کی خاموشی کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اقبال کا خط آیا ہوتا تو وہ خود اسے لا کر دیتی۔ سُناتی، مذاق کرتی، چھیڑتی۔ لیکن آیا ہوتا جب نا؟

ثریّا کو خاموش دیکھ کر، زبیدہ اخبارات دیکھنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سر اُٹھایا تو دیکھا۔ ثریّا بالکل خاموش ہے۔ سامنے وہ رہگذر ہے، جس پر سے اقبال کالج جایا کرتا تھا۔ کالج سے واپس آیا کرتا تھا۔ اسی رہگذر کو ثریّا ٹکٹکی لگائے کھڑکی میں بیٹھی دیکھ رہی ہے۔ زبیدہ نے نظر بھر کر ثریّا کو دیکھا۔ پھر نرمی اور آہستگی سے قریب آ کر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا، اور کہا:

"کس سوچ میں بیٹھی ہو ثریّا؟"

وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ بالکل خاموش۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زبیدہ پھر بولی:

"کیا دیکھ رہی ہو ادھر؟"

ثریّا نے رہگذر کی طرف دیکھتے ہوئے اور زبیدہ سے مخاطب ہوئے بغیر کہا:

"کچھ نہیں ـــــ اس پگڈنڈی پر سے زندگی کے بہتیرے مسافر گزرتے

رہتے ہیں۔ کچھ لوٹ آتے ہیں۔ کچھ نہیں لوٹتے!“

یہ کہہ کر ثریا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر اسی طرف دیکھنے لگی۔

زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ وہ بولی:

”اگر منزل میں کشش ہے، تو مسافر کہیں بھی ہو، لوٹ کر اسی کی طرف آتا ہے —— تو گھبراتی کیوں ہے پگلی؟ تیرا مسافر بھی ضرور واپس آئے گا!“

زبیدہ کی یہ باتیں سنتے سنتے ثریّا نے اپنے اوپر قابو پالیا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی:

”کچھ ہوش میں ہو؟ میرا مسافر کون؟“

زبیدہ جل ہی تو گئی، بل کھا کر بولی:

”پھر ابھی فلسفہ فلسفہ میں کیا فرمایا جا رہا تھا؟ مجھ سے اُڑتی ہو؟“

ثریّا نے بڑے اطمینان سے کہا:

کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی یونہی۔ تم نے بات کا بتنگڑ بنا دیا!“

زبیدہ نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا:

”دھن ہے مہاراج، تم سے کوئی جیت نہیں سکتا!“

ثریّا ہنسنے لگی اور زبیدہ پھر روٹھ کر چلی گئی، اور جاتے جاتے اس نے کہا:

”میں بھی بڑی بے غیرت ہوں۔ جو تم جیسی بے وفا پر مرتی ہوں!“

ثریّا آواز دیتی رہ گئی۔ لیکن وہ نہ رکی۔ چلی گئی ٭

باب ۱۰

چوری چھپے

چودھری، محمد علی اب بالکل اچھے ہو چکے تھے۔ صرف تھوڑی سی کمزوری باقی رہ گئی تھی۔ وہ اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے حقّہ پی رہے تھے۔ دلاور آیا، اور پائنتی بیٹھ گیا۔ حمیدہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ موقع دیکھ کر دلاور نے، چودھری صاحب کو پرچانا شروع کیا۔

"آپ کی سلامتی کے لیے کتنی کتنی دعائیں کر ڈالیں چچا۔ ٹھان لی تھی، قربان ہو جاؤں گا۔ مگر بال بیکا نہ ہونے دوں گا آپ کا!"

چودھری صاحب مسکرائے اور "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ دلاور نے پھر کہا:

"خدا کا شکر ہے آپ بھلے چنگے ہو گئے اور میری محنت سوارت ہو گئی۔"

اس وقت چودھری صاحب بھی موج میں تھے۔ انھوں نے بھی دلا کو بڑھاوا دیا۔ بولے:

"ہاں بھئی، تمھاری عنایت کا شکر گزار ہوں۔ تم نہ ہوتے، تو میں مر ہی گیا ہوتا۔ کون میری رکھوالی کرتا۔ حمیدہ بیچاری کیا جانے تیمار داری کسے کہتے ہیں؟"

"جی اور کیا!"

بہت مشفقانہ لہجہ میں چودھری صاحب نے کہا:

"جیو بیٹا!"

دلاور نے لپک کر کہا:

"مجھے تو آپ کا غلام بن کر رہنا ہے، آپ ہی کے سایہ میں!"

اتنے میں حمیدہ دوا کی شیشی لیے ہوئے باہر سے آئی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر کھٹکی۔ دلاور اسے دیکھ کر چونکا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حمیدہ کی نظروں میں نفرت تھی۔ دلاور کی آنکھوں میں لالچ اور ہوس چمک رہی تھی۔ دلاور نے حمیدہ کی طرف دیکھ کر امجد علی سے کہا:

"میں آخر کس لیے ہوں؟ کیا میں ڈاکٹر کے ہاں نہیں جا سکتا؟ دوا نہیں لا سکتا؟"

حمیدہ نے تلخ لہجہ میں کہا:

"کیوں نہیں، تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ جھاڑو بھی دے سکتے ہو کھانا بھی پکا سکتے ہو۔ لیکن تم آئے کیسے؟"

"اپنے چچا کے پاس آیا ہوں!"

"لیکن اب تک کہاں تھے؟"

"یہ تو سُنتے ہو چچا؟ جیسے میں آیا ہی نہیں۔ مَیں نے تمھاری خدمت ہی نہیں کی!"

حمیدہ چڑچڑے پن سے بولی:

"بڑا حوصلہ ہو گیا ہے اب تو؟"

دلاور نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا:

"کب نہیں تھا؟"

"بابا کو طاعون تھا، اور آپ پاس بیٹھے ہیں!"

طاعون کا نام سنتے ہی دلاور پھر سہم گیا۔

"تو مطلب یہ ہے کہ میں چلا جاؤں؟"

"تم جانو۔ میں کیا کہوں؟"

"اچھا بھئی جاتے ہیں!"

اور واقعی وہ فوراً "رفو چکر" ہو گیا۔ امجد علی نے زہر خند کرتے ہوئے کہا:

"کیسی کیسی ڈینگیں مار رہا تھا لچا کہیں کا!"

"شہدا کہیں کا! یہ اس قابل نہیں ہے بابا کہ گھر میں آئے!"

"جانتا ہوں بیٹی!"

"مجھے چھیڑا کرتا ہے!"

"چھیڑتا ہے تجھے؟"

"ہاں بڑے گندے گندے اشارے کرتا ہے اور ایسی باتیں کہتا ہے جنھیں میں دہرا نہیں سکتی۔ آپ منع کر دیجیے!"

چودھری کو غصہ آ گیا:

"اب آیا تو پاؤں توڑ دوں گا سالے کے، سمجھا کیا ہے مجھے؟"

حمیدہ نے باپ کو دوا پلائی اور خود دوسرے کام کاج میں لگ گئی۔

شام کو وہ نواب صاحب کے باغیچہ میں جو ان کی کوٹھی میں واقع تھا، پہنچی۔ اس وقت موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اتنے میں اقبال آ گیا۔ اسے دیکھ کر حمیدہ پھول کی طرح کھل گئی۔ اس نے کہا:

آ گئیں حمیدہ؟"

"کیسے نہ آتی، آپ نے بلایا جو تھا؟"

"اتنا خیال کرتی ہو میرا؟"

حمیدہ شرما گئی۔ اقبال اور قریب آ گیا۔ اس نے حمیدہ کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی۔ آنکھوں سے آنکھیں ملائیں، اور پوچھا:

"بولو، جواب دو!"

وہ پھر گھبرا گئی۔ اس نے گردن نیچی کر لی۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سامنے گلاب کا ایک خوبصورت درخت تھا۔ حمیدہ نے ایک پھول توڑ لیا اور اسے سونگھنے لگی۔ اقبال نے بھی فوراً ایک پھول توڑا اور حمیدہ کے بالوں میں اٹکاتے ہوئے کہا:

"ایک مسافر کا حقیر نذرانہ!"

سامنے ایک حوض تھا۔ اقبال نے کہا:

"آؤ دیکھو کتنا اچھا لگتا ہے یہ!"

دونوں آ کر حوض کے کنارے بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے حمیدہ نے اپنے

ہاتھ کا پھول اقبال کے کوٹ میں اُلجھا دیا اور بولی:

"ایک غریب کا ناچیز تحفہ!"

دونوں حوض کے کنارے بیٹھ گئے، اور پانی میں دیکھنے لگے۔ اقبال نے حمیدہ کے عکس کی طرف دیکھتے ہوئے حمیدہ سے کہا:

"یہ کون ہے؟"

وہ مسکرا دی۔ اس نے کہا:

"آپ ہی بتائیے کون ہے یہ؟"

اقبال نے کہا:

"چور!"

حمیدہ نے حیرت کے ساتھ کہا:

"چور؟"

"ہاں اس نے میری بڑی قیمتی چیز چُرائی ہے!"

"احتیاط نہ کی ہوگی آپ نے؟"

"بہت کی پھر بھی اس نے میری زندگی پر ڈاکہ ڈالا، اور میرا دل چُرا لیا۔"

"تو آپ اتنے غافل کیوں تھے؟"

"غافل کہاں تھا۔ دل کا قافلہ لُٹتا رہا، اور میں دیکھتا رہا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ لُوٹ لیا، لُوٹنے والے نے سب کچھ!"

حمیدہ نے حوض میں جھانکتے ہوئے اقبال کے عکس کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا:

"ان ذات شریف کو آپ جانتے ہیں ؟"

"جانتا ہوں ایک مظلوم ہے بیچارہ !"

"جی مظلوم نہیں اُستاد !"

"کسے کہہ رہی ہو حمیدہ ؟"

"انہی حضرت کو !"

"یہ تو بڑا معصوم ہے !"

"جی نہیں، بڑے لٹیرے، اور لوگ تو ڈاکہ ڈالتے ہیں اور یہ باتوں باتوں میں چوری کرے چلتے ہیں ؟"

"چوری ؟"

"جی جناب !"

"کیا چرایا اس نے ؟"

"کھوٹا سا دل دے کر اچھا سا دل اُڑا لے گئے۔ اور بنتے ہیں بڑے معصوم بڑے مظلوم !"

اقبال نے ایک چھوٹا سا پتھر حمیدہ کے ہاتھ میں دے کر کہا:

"تو لو، مارو اسے !"

حمیدہ نے وہ پتھر لے کر حوض میں پھینک دیا، اور دونوں ہنسنے لگے۔ اقبال نے کہا:

"آج کا سماں کتنا سُہانا ہے، ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ ایسے میں کوئی گائے تو دل جھوم جھوم جائے۔ حمیدہ کچھ سناؤ !"

"کہانی کوئی ——— ایک تھا بادشاہ!"

"یہ نہیں، گاتا!"

"مجھے نہیں آتا"

"آتا ہو یا نہ آتا ہو، سُنانا پڑے گا!"

حمیدہ خاموش ہو گئی۔ آہستہ آہستہ گنگنانے لگی۔ اور پھر اس نے ایک پُرا مدھر گیت گایا۔ فضا ساکن تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ نشہ چھایا ہوا ہے ساری کائنات پر۔ اقبال پر تو تاثر کا ایک عجیب عالم طاری تھا۔ حمیدہ دفعتہً گاتے گاتے رُک گئی۔ اقبال نے پوچھا:

"رک کیوں گئیں؟ گاؤ، گاتی جاؤ، گاتی رہو!"

حمیدہ نے سہمے ہوئے انداز میں جھاڑی کی طرف دیکھ کر کہا:

"کوئی ہے!"

اقبال نے بے پروائی سے کہا:

"سایہ سے بھڑکتی ہو؟ یہاں کون آسکتا ہے؟"

اتنے میں دلاور سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر حمیدہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اقبال بھی گھبرا گیا۔ دلاور نے اطمینان سے کہا:

"میں آسکتا ہوں۔ میں آگیا!"

حمیدہ اور اقبال خاموش تھے۔ دلاور نے حمیدہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"یہ گلچھرے اُڑائے جا رہے ہیں یہاں؟"

GIRLS SECONDARY SCHOOL LIBRARY

پھر وہ اقبال کی طرف متوجہ ہوا:

"کہیئے ڈاکٹر صاحب کیسا مزاج ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟"

حمیدہ اور اقبال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دلاور نے اقبال سے کہا:

"آپ ہمارے گاؤں میں اس لیے آئے ہیں کہ یہاں کی انجان اور نادان چھوکریوں کو ورغلائیں؟ ابھی جاتا ہوں نواب صاحب کے پاس، اور سارے گُن کھول کر رکھ دوں گا آپ کے۔ بڑے چھپے رستم نکلے آپ تو!"

دلاور چلا گیا۔ اور یہ دونوں دم بخود رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حواس درست کر کے حمیدہ نے کہا:

"اب کیا ہوگا؟"

اور وہ رونے لگی۔ اقبال نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"گھبراتی کیوں ہو؟ وہ کیا کرے گا؟"

"سارے گاؤں میں نکّو کر دے گا، یا بابا مار ڈالیں گے مجھے جان سے!"

"ایسا نہیں ہو سکتا حمیدہ! میں جس طرح بھی ہوگا اس کا منہ بند کر دوں گا۔ اور بدمعاش آدمی بڑا لالچی ہوتا ہے۔ یہ پرلے درجے کا لُچّا اور بدمعاش ہے!"

حمیدہ نے سہم کر کہا:

"دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ذرا بھی نہ گھبراؤ۔ چلو میں تمھیں گھر تک پہنچا دوں۔"

اور وہ حمیدہ کو لے کر چل کھڑا ہوا۔

باب ۱۱

مکتوبِ محبّت

"نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو جمال پور کی اور جمال پور سے زیادہ اقبال کی صحت و عافیت کی طرف سے تشویش تھی۔ لیکن اقبال کے تازہ خط نے ان کی تشویش کو اطمینان و مسرّت سے بدل دیا تھا۔ اقبال نے لکھا تھا۔ کہ اب جمال پور کی حالت سدھر چکی ہے۔ ہفتہ عشرہ میں انشاءاللہ طاعون کا نام و نشان بھی نہ رہ جائے گا۔ اور پھر میں قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ آپ کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ میں اس وقت اقبال ہی کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی دونوں اس کی سعادت مندی اور خوش اطواری سے بہت خوش تھے۔ اور یہ دیکھ کر ان کی خوشی اور بڑھ جاتی تھی کہ ان کی تعلیم و تربیّت کتنا اچھا رنگ لا رہی ہے۔ بیگم نے کہا :

"اقبال نہیں ہے تو یہ گھر سُونا سُونا لگتا ہے !"

نواب صاحب نے کہا :

"کیوں نہ لگے۔ وہ اب غیر کہاں ہے؟ اس خاندان کا ایک ممبر ہے۔ ہمارا ہر کام اس نے اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ جیالا اتنا ہے کہ دیکھو آگ

میں کُود پڑا جا کر۔"

"میں کہتی ہوں آپ نے جانے کیوں دیا؟ اگر خدانخواستہ کچھ ہو جاتا اسے"

"میں نے جانے دیا، تو تم نے کیوں نہیں روک لیا؟ بات ہی ایسی تھی کہ نہ تم روک سکتی تھیں، نہ میں۔ خیر ان شکایتوں کا کیا موقع؟ اب تو وہ آنے ہی والا ہے؟"

ثریّا کسی کام سے ادھر سے گزری۔ اس نے ماں باپ کی باتیں سُن لیں۔ اس کا اُترا ہُوا چہرہ پھر شگفتہ ہو گیا۔ دل گھُٹا گھُٹا سا رہتا تھا۔ اب اس میں پھر جولانیاں پیدا ہونے لگیں۔ اقبال کی جدائی نے نشاط و مسرّت پر چھاپہ مارکے ایک مستقل غم، ایک مستقل درد کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ دفعتہً یہ سُن کر کہ وہ خیریت سے ہے، اور جلد آنے والا ہے، نشاط و مسرّت کا ایک عجیب عالم طاری ہو گیا۔ وہ خلافِ عادت، مسکراتی ہوئی، زبیدہ کے کمرہ میں پہنچی۔ دیکھا بڑے انہماک سے وہ کچھ لکھ رہی ہے۔ ثریّا اور قریب پہنچی۔ زبیدہ اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ اور اپنے لکھے ہوئے کو چھپانے لگی۔ ثریّا نے پوچھا:

"کیا لکھا جا رہا ہے؟ کوئی غزل؟"

زبیدہ کاغذ سمیٹتے ہوئے بولی:

"نہیں خط!"

"کسے؟ وہ کون خوش قسمت ہے، جو تمھیں یاد آ رہا ہے؟ جسے تم خط لکھ رہی ہو؟"

"ہے کوئی تمھیں کیا!"

ثریّا مسکرائی :

"ہے کیوں نہیں، اے غضب خدا کا۔ جوان جہان لڑکی، غیر مردوں کو خط لکھے، اور میں بیٹھی دیکھتی رہوں؟ جاتی ہوں، امّی حضور سے ایک ایک کی دس دس لگاؤں گی!"

زبیدہ نے دیکھا۔ آج خلافِ معمول ثریّا بہت خوش ہے۔ وہ بھی اسے خوش دیکھ کر ترنگ میں آ گئی۔ کہنے لگی :

"غیر مردوا کیوں ہوتا، اپنا ہے جسے لکھ رہی ہوں خط!"

ثریّا نے ماتھے پہ ہاتھ مار کر کہا :

"ہائے غضب، یہ تو ہاتھ سے گئی ——— اے میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ جو "اپنا" ہو گیا، اور ہمیں خبر بھی نہیں؟"

"پھر وہی، ہے کوئی۔ کیوں بتائیں؟"

"نہ بتاؤ، امّی حضور آ کر خود پوچھ لیں گی۔ انھیں بھی نہ بتانا تو جانوں گی!"

ثریّا باہر جانے کے لیے مڑی۔ زبیدہ نے بڑھ کر اسے روکا :

"ارے تم تو خفا ہو گئیں؟ ——— اچھا آؤ بتائے دیتی ہوں!"

ثریّا پاس آ کر بیٹھ گئی :

"بتاؤ ——— لاؤ دیکھیں!"

"دکھاؤں گی نہیں، سنا دوں گی۔"

"ہم تو دیکھیں گے!"

"ضد نہ کرو ثریّا، سن لو!"

"اچھا سناؤ!"

زبیدہ نے اپنا لکھا ہوا خط سنانا شروع کیا:

"بے وفا، بے مروت، سنگدل!"

"یہ کیا ہے القاب؟"

"ہاں ہاں، سنتی ہو یا نہیں؟"

"اچھا سناؤ، اب نہیں بولیں گے!"

"دل کی دنیا تم سے آباد تھی، لیکن اب سونی پڑی ہے۔ سورج اسی طرح نکلتا ہے۔ چاند اسی طرح چمکتا ہے۔ تارے اسی طرح کھلتے ہیں۔ دنیا کی رونق اسی طرح قائم ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ سورج کی چمک کسی نے چھین لی ہے۔ چاند کی روشنی ماند ہو گئی ہے۔ تارے بے نور ہو گئے ہیں، اور دنیا کی رونق ختم ہو گئی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ میری دنیا تم تھے۔ میری امیدوں کے آسمان تم ہی تھے، جو سورج کی طرح جگمگاتے، چاند کی طرح چمکتے اور تاروں کی طرح جھلملاتے تھے ــــــ

ثریا سے ضبط نہ ہو سکا، وہ بول پڑی:

"زبیدہ یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ کس سے پینگ بڑھائے جا رہے ہیں؟ تو اپنے ساتھ سارے خاندان کی ناک کٹوائے گی؟ اُف رے تیرا دیدہ تو اب زبیدہ نہیں رہی، کچھ اور بن گئی ہے۔ مجھے تو سوچ سوچ کر ہول ہو رہا ہے۔"

زبیدہ روٹھ گئی۔ اس نے کہا:

اسی لیے میں نہیں سُناتی تھی، جاؤ اب نہیں سُناؤں گی!"

"ہائے میرے اللہ، تو ابھی کچھ اور باقی ہے؟ یہ کیا طومار لکھ مارا ہے تُو نے؟"

"باقی کیوں نہیں ہے؟ یہ تو صرف تمہید تھی!"

"یہ صرف تمہید تھی؟ ابھی اصل نامہ باقی ہے؟"

"ہاں!"

"اچھا سناؤ!"

"نہیں سُناتے!"

"اب نہیں بولوں گی، وعدہ کرتی ہوں!"

"جھوٹی کہیں کی!"

"نہیں سچ، اب نہیں بولنے کی!"

"تو سنو، لیکن اب بیچ میں نہ ٹپک پڑنا!"

زبیدہ نے پھر سنانا شروع کیا:

"تم میری زندگی ہو، تمھارے بغیر زندگی بیکار ہے۔ تمھارے بغیر میں ایک پل بھی سُکھی نہیں رہ سکتی۔ تم نے مجھے ایک خط بھی نہیں لکھا حالانکہ میں تمھیں روز خط لکھتی رہی۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمھیں بھیج نہ سکی۔ تم میرے پاس ایک دفعہ بھی نہ آئے۔ حالانکہ میں ہر لمحہ تمھارے ہی پاس گزارتی ہوں۔ سچ مچ نہ سہی، عالمِ خیال میں سہی۔ آخر جدائی کے دن کب ختم ہوں گے؟ یہ فراق کی راتیں کب کٹیں گی؟ یہ دکھ درد کی گھڑیاں کب بیتیں گی؟ سچ کبھی میں بھی یاد آتی ہوں تمھیں؟ کبھی یاد کرتے ہو مجھے؟ میں اپنے دل کو جھوٹی تسلّی دیتی رہتی

ہوں۔ لیکن کب تک اس نامراد کو بہلا سکوں گی!"

ثریا بولی:

"بس کرو زبیدہ!"

"ہاں اب ختم بھی ہو گیا:"

زبیدہ نے خط اور قلم ثریا کی طرف بڑھایا، اور کہا:

"لو دستخط کردو!"

"دستخط کردوں، مَیں؟"

"ہاں تم، جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے۔ پھر ڈاک نکل جائے گی!"

"کچھ پگلی ہوئی ہے، میں کیوں دستخط کروں؟!"

"یہ لو، خط بھی میں لکھوں، دستخط بھی میں ہی کردوں؟ کہو تو شادی بھی میں ہی کر لوں تمھاری بجائے؟"

"کیا مطلب؟"

"اقبال کو خط لکھا ہے مَیں نے تمھاری طرف سے! — لو کرو، دستخط!"

ثریا نے خط لے کر پھاڑ دیا اور غصّہ سے بولی:

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی؟"

"کیا کیا مَیں نے؟"

"پھر یہ بھی پوچھتی ہو؟ — اپنی طرح تم نے مجھے بھی بے حیا سمجھ رکھا ہے — خبردار جو آئندہ اس طرح کا مذاق کیا تو نے؟

میں ثریا ہوں۔ مذاق میں بھی ان باتوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔ اس سلسلہ میں اگر میں تم سے خفا ہوئی۔ تو پھر کبھی نہ منوں گی۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے !"

زبیدہ کی آنکھوں میں بات کا بتنگڑ بنتے دیکھ کر آنسو آ گئے۔ اور وہ چپ چاپ چلی گئی !

باب ۱۲

رشوت

رات کو اقبال، دلاور کے گھر پہنچا۔ اس وقت وہ شراب پیئے ہوئے تھا۔ آنکھیں لال بھبوکا، لیکن ہوش میں تھا۔ اقبال کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں بڑی کڑواہٹ تھی۔ پھر اس نے طنزیہ لہجہ میں کہا:

"ہم غریبوں پہ یہ مہربانی کیسے ہو گئی سرکار؟ خود کیوں آئے ہمیں یاد کر لیا ہوتا!"

"ایک ہی بات ہے، میں آ گیا تو، تم چلے آتے تو!"

"کہیئے کیا حکم ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"حکم کا ہے کا؟ کچھ باتیں کرنا تھیں تم سے!"

"فرمایئے! —— لیکن میں سمجھ گیا! ——"

"تم ٹھیک سمجھے، میں چاہتا ہوں، ہمارا راز تمہاری زبان تک آئے کبھی نہ آئے!"

نلاور نے ایک قہقہہ لگایا:

"میں جانتا تھا آپ آئیں گے۔ آپ کی "قیمتی باتیں" سننے کا میں مشتاق تھا!"

"ٹھیک ہے، تم جو قیمت چاہو، ملے گی!"

دلاور پھر ہنسا،

"جیسا قیمتی راز ہے، ویسی ہی قیمت بھی ہونی چاہیئے۔ ورنہ یہ یاد رکھیئے میرے منہ کا ایک بول، حمیدہ کی ناک کٹوائے گا۔ آپ کو نکو کرے گا۔ اور نواب صاحب کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھے گا ——— سمجھ گئے آپ؟ ہاں خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے!"

"سمجھ لیا میں نے۔ تم نے جو کچھ کہا، سچ کہا۔ میں تمھیں مُنہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں!"

"ہاں کیوں نہ ہو، آخر نواب کے بیٹے ہو!"

"نہیں، یہ تو کوئی بات نہیں۔ لیکن میں تمھیں خوش کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر اقبال چلا، دلاور نے کہا:

"آپ چلے کہاں؟"

"اب جاتا ہوں!"

"بے قیمت دیئے؟ بغیر خوش کیے؟"

"تم اطمینان رکھو دلاور!"

"اطمینان کا ہے کا سرکار؟ کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ لائیے کیا دیتے ہیں آپ؟"

اقبال نے قدرے تلخی کے ساتھ کہا:

"تو تم سودا کرنے پر تلے ہوئے ہو؟"

"تو آپ آئے کس لیے تھے؟"

"معاملہ میں نے طے کر لیا۔ اب مجھ پہ چھوڑ دو۔"

"یعنی پھر کبھی؟ ——— نا صاحب یہ نہیں ہوئے گا۔ قیمت رکھیے اور تشریف لے جائیے، ورنہ پھر میں ذمہ دار نہیں!"

اقبال سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے ساتھ جتنا روپیہ لایا تھا سب دیہات کے غریبوں پر خرچ کر چکا تھا۔ اس نے اور روپیہ منگایا تھا۔ اور وہ دو ایک روز میں آنے والا تھا۔ اس وقت اس کی جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ پڑا تھا۔ وہی اس نے دلاور کی طرف بڑھا دیا۔ دلاور نے نوٹ لے لیا اور بپھر کر کہا:

"بس"؟"

"نہیں بھائی، بس کہاں؟ اس وقت یہی رقم تھی وہ دے دی۔ گھر سے روپے منگائے ہیں۔ آج کل میں آ جائیں گے، پھر اور لے لینا!"

"اپن اُدھار نہیں کرتے ڈاکٹر صاحب۔ ایک ہزار سے ایک پائی کم نہ لوں گا۔ اور یہ نتو کا ٹکڑا الگ۔ اگر منظور ہو تو سودا کیجیے۔ ورنہ آپ اپنے راستے بندہ اپنے راستے!"

اقبال نے کہا:

"خفا کیوں ہوتے ہو بھائی، ایک ہزار لے لینا۔ اب تو خوش ہو؟"

"لیکن کب لے لینا؟"

"کہہ تو رہا ہوں۔ آج ہی کل میں روپیہ آنے والا ہے!"

"ہم اُدھار نہیں کرتے ڈاکٹر صاحب؟ یہ نہ ہوگا!"

"تو اب اس وقت کہاں سے لاؤں؟ یہاں کوئی قرض بھی تو نہیں دے سکتا!"

"کیوں نہیں دے سکتا، چودھری صاحب سے کہیئے۔ وہ بندوبست کر دیں گے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو دلاور۔ مَیں ان سے کہہ سکتا ہوں بھلا؟"

"یہ تو مَیں بھول ہی گیا تھا۔ آپ کا اُن کا رشتہ ہی شرم کا ہے!"

اقبال یہ کڑوی کسیلی باتیں سن کر برابر ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اس نے کہا:

"ہاں بھئی، تو دو دن کے لیے تم میرا اعتبار نہ کرو گے؟"

"اور ہر معاملہ میں کر لوں گا۔ لیکن اس معاملہ میں مجبور ہوں!"

"پھر کیا کیا جائے؟ روپیہ تو میرے پاس ہے نہیں۔"

"یہ بھی خوب رہی۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں۔ آخر کس برتے پر اپنا راز خریدنے آپ میرے پاس آئے تھے؟"

اقبال نے خالی ہونے کے باوجود، ایک مرتبہ پھر جیب ٹٹولی اور اسے خالی پا کر، وہ انگوٹھی دلاور کے ہاتھ میں رکھ دی۔ جو اسے ثریا نے تحفہ کے طور پر دی تھی۔ دلاور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اقبال نے کہا:

"اسے معمولی نہ سمجھنا، یہ ہزاروں کا مال ہے!"

دلاور نے اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا، اور جیب میں رکھ لیا۔ اقبال نے کہا:

"اسے بطورِ امانت چھوڑے جاتا ہوں۔ دو ایک دن کے بعد روپیہ دے کر لے لوں گا!"

"یہ میرے کس کام کی چیز ہے؟ جس دن روپیہ آئے اُسی دن لے جائیے۔ ——— ورنہ یہی انگوٹھی لے کر پہنچوں گا نواب صاحب کے دربار میں سمجھے؟"

"خوب اچھّی طرح سمجھ گیا۔ اچھا اب جاتا ہوں!"

دلاور نے جیب سے شراب کا ادّھا نکالا اور سامنے رکھ کر بولا:

"اور آپ کی کیا خاطر کروں؟ یہ وال دلیا حاضر ہے!"

"شکریہ، شوق کیجیے!"

اقبال چلا گیا۔ اور دلاور نے ایک ہی گھونٹ میں ادّھا صاف کر دیا۔

باب ۱۳

ایک اور مصیبت

جمال پور کے حالات سدھر چکے تھے۔ وبا بالکل دُور ہو چکی تھی۔ اقبال ارادہ کر رہا تھا کہ شہر واپس جائے۔ لیکن حمیدہ کی کشش اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے؟ بغیر کسی سبب کے اس کا جمال پور میں رہنا نامناسب تھا۔ اور شہر واپس جاتا تھا، تو حمیدہ بغیر زندگی وبال تھی۔ چودھری صاحب اس کے اتنے قائل ہو چکے تھے کہ وہ فوراً حمیدہ کی شادی اس کے ساتھ کر دیتے۔ لیکن کیا نواب صاحب اجازت دیں گے؟ کیا بیگم صاحبہ راضی ہو جائیں گی؟ زبیدہ تو میرا مذاق نہیں اُڑائے گی؟ ثریا بیگم تو میری اس حرکت کو خلاف شرافت نہیں قرار دیں گی؟ دن اسی کشمکش میں اور رات اس فکر میں گزرتی تھی۔ مگر اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ دلاور کے واقعہ کے بعد سے اقبال نے حمیدہ سے ملنا کم کر دیا تھا۔ اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصہ کے لیے شہر چلا جائے۔ دلاور کی رقم ادا کر کے انگوٹھی واپس لے لے۔ اور پھر تبادلۂ آب و ہوا کے بہانے سے کچھ روز کے لیے جمال پور میں آ کر رہے۔

رات کو وہ یہی پروگرام بنا کر سویا۔ صبح آنکھ کھلی تو بخار میں لت پت تھا اس کا معمول تھا۔ صبح کا ناشتہ وہ چودھری صاحب کے ہاں کرتا تھا۔ آج اتنی دیر ہو گئی وہ نہیں آیا۔ حمیدہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اور چودھری صاحب علانیہ پریشان ہو رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا :

"آج اقبال میاں نہیں آئے !"

"جی نہیں آئے !"

"چلی جا بیٹی ، ذرا دیکھ آ !"

بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ ناشتہ کا سامان چھوڑ چھاڑ اقبال منزل کی طرف لپکی۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا۔ کہ اقبال نیم بے ہوش کھسما کھوات بخار میں پڑا ہُوا ہے۔ اس نے نبض ٹٹولی ، ماتھا دیکھا۔ پنڈے پر ہاتھ رکھا ، دل کی دھڑکن سُنی۔ آواز دی۔ کچھ جواب نہ پا کر اُلٹے پاؤں سہمی ہوئی اور گھبرائی ہوئی واپس آ گئی۔ باپ نے اس رنگ میں اسے دیکھ کر پریشان ہو کر کہا :

"کیا ہُوا بیٹی ؟"

حمیدہ کی آنکھوں کا پیمانہ شراب چھلک رہا تھا۔ وہ اور گھبرا گیا۔ اس نے اضطراب کے ساتھ کہا :

"کیا ہُوا بیٹی ؟ تو رو کیوں رہی ہے ؟ کیا دلاور مل گیا تھا راستے میں ؟"

وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی :

"نہیں!"

"پھر کیا ہُوا؟ کہتی کیوں نہیں؟"

"وہ بیمار ہیں!"

"کون؟ اقبال؟"

"ہاں، بخار میں لت پت پڑے ہیں۔ تن بدن کی خبر نہیں۔ میں نے پکارا جواب نہیں دیا۔ پنڈے پر ہاتھ رکھا جیسے آگ!"

چودھری امجد علی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ سُن کر ناشتہ یونہی چھوڑ چھاڑ فوراً اقبال کے پاس پہنچے۔ حمیدہ بھی ان کے پیچھے پیچھے موجود تھی۔ اُنھوں نے اقبال کو دیکھا۔ فوراً سمجھ گئے۔ طاعون کا حملہ ہے۔ وہ خود بھی اس مرض کے مریض رہ چکے تھے اور سیکڑوں مریضوں کو دیکھ کر اس کی علامتیں پہچان چکے تھے۔ ان کا ہاتھ پہلے نبض کے بجائے گلٹی پر گیا، اور اسے دیکھتے ہی صورتِ حال کی نزاکت کا انھیں احساس ہو گیا۔ اتنے میں گاؤں کے اور بھی بہت سے لوگ آ موجود ہوئے تھے۔ کون تھا جو اقبال کا ممنونِ کرم نہ ہو؟ جس کے لیے اقبال نے تکلیف نہ اٹھائی ہو۔ چودھری نے ایک نظر حاضرین پر ڈالی۔ پھر کلّو سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے دیکھتا کیا ہے؟ جا سامنے والے گاؤں سے وید جی کو بُلا لا!"

کلّو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ پھر اُنھوں نے ستیر خاں سے کہا:

"بھائی، دیکھ رہے ہو کیا حالت ہے؟ وید جی آتے ہوں گے یہ سچ

لیکن اس کی خبر فوراً نواب صاحب کو ہونا چاہیئے !"

" چلا جاؤں چاچا ؟ "

" ہاں بیٹیا فوراً !"

شیر خاں نے اپنا ڈنڈا سنبھالا۔ اور تیر کی طرح شہر روانہ ہو گیا۔

نواب صاحب اطمینان سے اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ یک بیک شیر خاں پہنچا۔ چہرہ گرد سے اٹا ہوا۔ پریشانی چہرے سے عیاں، نواب صاحب نے نگاہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا :

" تم کون ہو ؟ "

" حضور کی رعیت ہوں سرکار ! "

" کہاں سے آئے ہو ؟ "

" جمال پور سے ! "

جمال پور کا نام سُن کر نواب صاحب چونکے، شطرنج سے مُنہ موڑ کر بالکل شیر خاں کی طرف متوجّہ ہو گئے۔

" خیریت ؟ چودھری امجد علی اب کیسے ہیں ؟ "

" بالکل اچھے سرکار —— لیکن —— "

" کہو، کیا کہتے ہو ؟ "

" لیکن انھیں اچھا کرنے والا بیمار پڑ گیا حضور ! "

" تم اقبال کو کہہ رہے ہو ؟ "

" جی حضور ! "

"(گھبرا کر) اقبال بیمار ہے؟"

"جی سرکار!"

نواب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے:

"اقبال بیمار ہے؟"

"جی سرکار!"

"بخار ہے اُسے؟"

"بڑے زور کا سرکار!"

"تم اسے یہاں کیوں نہ لے آئے؟"

"اسی لیے تو آیا ہوں سرکار! موٹر لے چلیے!"

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔ میں خود اُسے جا کر لاؤں گا۔ تم ٹھہرو!"

شیر خاں بدستور کھڑا رہا۔ نواب صاحب زنان خانہ میں پہنچے۔ اس وقت ثریا بھی بیگم صاحبہ کے پاس موجود تھی۔ اور زبیدہ حسبِ معمول ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ نواب صاحب کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر بیگم صاحبہ گھبرا گئیں:

"الٰہی خیر، کیا ہوا؟ پریشان کیوں ہو؟"

وہ بات ٹالتے ہوئے بولے،

"کچھ نہیں!"

"پھر یہ چہرہ اُترا اُترا کیوں ہے؟"

"جمال پور سے آدمی آیا ہے!"

"اے میں قربان، میرا اقبال آ گیا؟"

"نہیں ـــ اسی کو لینے جا رہا ہوں!"

"تم لینے جا رہے ہو؟ خود کیوں نہیں آ گیا؟"

"وہ بیمار ہے!"

یہ سنتے ہی ثریا سفید پڑ گئی۔ زبیدہ کا ہنسنا بند ہو گیا۔ بیگم صاحبہ لڑکھڑائیں:

"اقبال کے دشمن بیمار ہیں، یہ کس نے کہا؟"

"آدمی آیا ہے!"

"آدمی آیا ہے؟ ـــ کیا اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"ہاں! یہی معلوم ہوا ہے!"

"ہائے میرے اللہ، تو پھر کیا ہوگا؟ ڈاکٹر کو کیوں نہیں بھیجتے؟ اسے بلا کیوں نہیں لیتے؟"

"دونوں کام کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر یہیں آ کر اسے دیکھے گا۔ میں جا کر ابھی لاتا ہوں اسے! تم اس کا کمرہ صاف کرا دو!"

ثریا جھپک کر اٹھی۔ تیزی سے اقبال کے کمرہ میں پہنچی۔ اور اس کی صفائی میں لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں اس نے کمرہ کو آئینہ بنا دیا۔ زبیدہ بھی کچھ دیر کے بعد آ گئی۔ وہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ بیگم صاحبہ فوراً مصلے پر بیٹھ اور گڑگڑا کر دعا مانگنے لگیں۔

نواب صاحب افتاں و خیزاں ایمبولینس کار لے کر جمال پور پہنچے۔ اقبال منزل میں دیہاتیوں کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ اپنے محسن اور محبوب کے لیے

بیقرار تھے۔ ایک دلاور تھا۔ جو الگ کونے میں کھڑا اقبال کی حالت اور لوگوں کی کیفیت دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ چودھری صاحب اس کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ ویدجی آگئے تھے۔ اور وہ دوائیں تجویز کر رہے تھے۔ ایک گوشہ میں گم صُم حمیدہ کھڑی ہوئی تھی۔ اتنے میں نواب صاحب آئے۔ انھیں دیکھ کر مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ سب لوگ جھک جھک کر انھیں سلام کرنے لگے۔ انھوں نے کسی کی طرف نہ دیکھا۔ سیدھے اقبال کے بستر علالت پر پہنچے۔ اور چودھری صاحب سے پوچھا:

"کیا حال ہے اب؟"

"وہی حال ہے اب:"

"وہی حال ہے حضور، دیکھ لیجیے!"

ویدجی نے کہا:

"گھبرائیں نہیں سرکار، رام بھلی کرے گا!"

نواب صاحب نے اقبال کے بدن پر ہاتھ رکھا، جو اب تک تپ رہا تھا۔ پھر چودھری سے کہا:

"میں موٹر لایا ہوں۔ اقبال میرے ساتھ جائے گا!"

لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اقبال کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمبولینس کار تک پہنچایا۔ اور نواب صاحب اپنی امانت اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ حمیدہ اب تک ایک کونے میں کھڑی تھی، اس کی آنکھوں میں دو چمکتے ہوئے موتی جگمگا رہے تھے اور وہ بھاگتی ہوئی موٹر کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔

باب ۱۴

دھوکا

اقبال کے جانے کے بعد، پکریا کے درخت کے نیچے چودھری صاحب چودھری بن کر بیٹھ گئے۔ گاؤں کے اور لوگ ان کے ارد گرد کچھ کھڑے تھے، کچھ بیٹھے تھے۔ اور اقبال کے متعلق باتیں چھڑ گئیں۔ چودھری صاحب نے کہا:

"کتنا شریف اور ہونہار لڑکا تھا!"

کلّو نے کہا:

"کیا کہیں چاچا، ایسا آدمی ہم نے تو دیکھا نہیں آج تک!"

شیر خاں بولے:

"وہ آدمی کب تھا؟ فرشتہ تھا فرشتہ!"

ایک آواز آئی:

"اچھا ہو جائے خدا کرے بیچارہ!"

دوسرا بولا:

"ہاں خدا کرے جلد اچھا ہو جائے۔ ہم سب کے لیے اس نے اپنی جان خطرہ میں ڈال دی!"

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ دلاور میدان خالی دیکھ کر چودھری کے گھر پہنچا۔ مغموم حمیدہ اقبال کی یاد میں مچھلی کی طرح تڑپ رہی، اور آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے دلاور کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور بگڑ کر بولی:

"تم، تم یہاں کیوں آئے؟"

دلاور کی آنکھیں نمناک ہو گئیں:

"تیرا دکھ بانٹنے آیا ہوں حمیدہ!"

"مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ! فوراً چلے جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا!"

"جاتا ہوں، لیکن مجھ سے تیرا یہ حال نہیں دیکھا جاتا۔ تو رو رو کر ہلکان کیوں ہو رہی ہے؟ خدا جو کچھ کرتا ہے، اچھا کرتا ہے۔ بیچارہ گاؤں والوں کا دکھ بانٹنے آیا تھا، خود ہی شکار ہو گیا۔ میں تو اس کی پٹی سے رات بھر لگا بیٹھا رہا۔ بیہوشی میں بھی اگر اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلتا تھا تو بس ایک حمیدہ کا نام اور کچھ نہیں!"

حمیدہ کا غصہ ختم ہو گیا۔ وہ اس ڈاکو کو اپنا ہمراز سمجھنے لگی۔ اس نے اپنائیت کے لہجہ میں پوچھا:

"مجھے یاد کر رہے تھے وہ؟"

"ہاں بہت!"

"کیا کہتے تھے؟"

"کہتے کیا، بس جہاں ذرا آنکھ کھلی حمیدہ حمیدہ پکارنے لگتے تھے۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔"

حمیدہ اپنا ذکر، اور اقبال کی یہ حالت سن کر رونے لگی۔ دلاور نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا:

"گھبراتی کیوں ہو؟ اچھّے ہو جائیں گے؟ شہر گئے ہیں۔ وہاں ایک سے ایک ڈاکٹر بھرا پڑا ہے۔ دیکھنا کل ہی خبر آتی ہے کہ اچھے ہو گئے!"

"خدا کرے — لیکن بابا کہہ رہے تھے طاعون ہے!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ بابا کو بھی طاعون تھا۔ اچھّے ہو گئے کہ نہیں؟"

حمیدہ نے روتے روتے بڑی معصومیّت اور بھولے پن سے کہا:

"میں پہنچی تو بیہوش ہو چکے تھے۔ ایک بات بھی مجھ سے نہ کر سکے وہ!"

دلاور نے پھر دلاسا دیا:

"تجھ سے بات نہیں کی، مجھ سے تو کی!"

حمیدہ نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا:

"تم سے باتیں کیں؟"

"ہاں بہت ساری!"

"کیا کیا؟"

"یہ نہ پوچھو!"

"بتاؤ تو! بتا دو دلاور!"

"اُسے بنگلے کو تمھارے سوا اور یاد ہی کیا تھا ؟"

حمیدہ پھر رونے لگی :

"مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی رات بھر ان کی پٹی سے تمھاری طرح لگی بیٹھی رہتی۔ انھیں پانی پلاتی۔ دوا دیتی۔ آرام پہنچاتی۔ میں کتنی بد قسمت ہوں !"

دلاور نے مشفقانہ لہجہ میں کہا :

"باؤلی کہیں کی ـــــ تو نہیں تھی، میں تو تھا۔ میں نے کوئی کسر اُٹھا رکھی؟ رام نگر سے جا کر عرق لایا، ساتوں رات ـــــ چھ کوس ہے چھ کوس !"

"تم کتنے اچھے آدمی ہو دلاور، میں تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی !"

"تم ابھی مجھے بالکل نہیں سمجھیں، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں !"

"معاف کرو میری غلطی۔ میں نے تم سے بہت بُرا سلوک کیا !"

"دیکھا جائے گا۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے جو کچھ کیا، اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ تم سے شاباش لینے کے لیے نہیں !"

حمیدہ نے عقیدت کی نگاہوں سے دلاور کو دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

دلاور نے کہا :

"وہ آدمی نہیں فرشتہ تھا، گاؤں کے لیے اس نے اپنے آپ کو ہلکان کر دیا۔ کسی کے درد ہو وہ بے قرار ہو جاتا تھا۔ کسی کے پھانس چبھے وہ بے کل ہو جاتا تھا۔ ایسا آدمی بیمار ہوتا اور میں گھر بیٹھا رہتا۔ کیا تم مجھے اتنا کٹھور سمجھتی ہو ؟"

حمیدہ اب بھی خاموش رہی۔ دلاور نے کہا:

"ہاں خوب یاد آیا۔ لو یہ انگوٹھی!"

دلاور نے انگوٹھی حمیدہ کی طرف بڑھا دی۔ حمیدہ نے جھک کر اسے لیا۔ اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ یہ اقبال کی تھی۔ وہ اس کی اُنگلی میں اُسے بارہا دیکھ چکی تھی۔ دیکھتے ہی پہچان گئی۔ بولی:

"یہ تو اُن کی ہے!"

"ہاں انھی کی، میں کب کہتا ہوں میری ہے؟"

"تمھارے ہاتھ کیسے لگی؟"

"جاتے جاتے دے گئے ہیں!"

"انعام؟"

"نہیں دیوانی ——— تیرے لیے۔"

"مجھے دے گئے ہیں؟"

"ہاں ہاں ——— بخار جب زیادہ بڑھا۔ تو سمجھ گئے، اب نواب صاحب آئیں گے اور لے جائیں گے۔ مجھ سے کہنے لگے، دلاور بھیا۔ یہ میری امانت اپنے پاس رکھ لو اور جب میں چلا جاؤں تو اسے حمیدہ کو دے دینا۔ حمیدہ کی اُنگلی میں اپنے ہاتھ سے پہنا دینا ——— بڑھاؤ ہاتھ اِدھر!"

حمیدہ نے ایک بے بس معمول کی طرح انگوٹھی اور اُنگلی دلاور کی طرف بڑھا دی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اسے پہنا دی، اور بولا:

"اب جا کے بوجھ ہلکا ہوا میرے دل کا ——— دیکھ حمیدہ اس تحفہ

کو بھول نہ جائیو!"

وہ سرشارِ محبت ہو کر بولی:

"نہیں اسے بھول نہیں سکتی۔ اسے اپنی جان کے ساتھ رکھوں گی۔ جان سے زیادہ عزیز سمجھوں گی!"

"مجھے یہی اُمید تھی ــــــ اچھا بڑی دیر ہو گئی، اب جاتا ہوں، سوچتا ہوں کل شہر جاؤں اور دیکھ آؤں جا کر، اقبال بھیّا کو، جی لگا ہوا ہے!"

حمیدہ نے کہا:

"ہاں ضرور، اور وہاں سے جب آنا تو سیدھے میرے پاس آنا۔ پہلے مجھ سے حال کہہ دینا، تب کسی اور سے کہنا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ اور بھی کہلوائیں، دیکھو جو کچھ وہ کہیں، یاد رکھنا، بھول نہ جانا!"

دلاور نے ایک قہقہہ لگایا:

"بھول جاؤں گا؟ میں کوئی بات نہیں بھولتا۔ جو کچھ وہ کہے گا۔ ایک ایک بات تجھ سے کہہ دوں گا آ کر ــــــ لیکن چودھری چچا نے دیکھ لیا تو؟ اُنھوں نے تو مجھے منع کر رکھا ہے کہ گھر میں قدم نہ رکھنا!"

حمیدہ بولی:

"وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں انھیں سمجھا دوں گی۔ وہ میرا کہنا مان لیں گے۔"

وہ جانے لگا۔ تو حمیدہ بولی:

"چائے پیؤ گے؟"

"اب نہیں، بہت دیر ہو گئی!"

"اچھا پان تو کھا لو!"

"ہاں پان کھا لوں گا، لاؤ!"

حمیدہ نے بڑے چاؤ سے بنایا، اور دلاور کی طرف بڑھا دیا۔ اتنے میں کچھ آہٹ آئی۔ دلاور جلدی سے سٹک گیا۔ اور حمیدہ کسی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنے گھر کے کام میں لگ گئی۔

باب ۱۵

تیمارداری

اقبال نیم مردہ حالت میں محلسرا لایا گیا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر، بیگم صاحبہ دہاڑیں مار کر رونے لگیں:

"ہائے میرے بچے کو کس کی نظر کھا گئی۔ میں صدقے!"

نواب صاحب نے کہا:

"یہ رونے کا وقت نہیں ہے، مریض کو سنبھالنے کا وقت ہے۔ ہمت سے کام لو۔ تم اسے سنبھالو۔ میں ڈاکٹر کی فکر کرتا ہوں۔"

ثریّا اقبال کے ساتھ ساتھ اس کے کمرہ میں پہنچی۔ اور اس کی تیمارداری میں منہمک ہو گئی۔ بیگم صاحبہ نے اپنے تئیں رونے دھونے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ زبیدہ پر سارے گھر کا انتظام آپڑا تھا۔ اور ثریّا ہمہ تن اقبال کی تیمارداری میں منہمک ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹروں کا تانتا لگ گیا۔ ایک سے ایک بہتر ڈاکٹر موجود۔ بہت توجّہ سے اقبال کا معائنہ کیا۔ اور فیصلہ کیا۔ مرض نے کافی شدت سے حملہ کیا ہے۔ لیکن اگر تیمارداری اچھی ہو گئی، تو خطرہ ٹل جائے گا۔ ڈاکٹر انجکشن دے کر اور نسخہ لکھ کر چلے گئے۔

جاتے جاتے ایک ڈاکٹر نے کہا :

" بہتر ہو، اگر انھیں نرسنگ ہوم بھیج دیجیے ! "

ثریّا بیچ میں بول پڑی :

" جو آرام گھر پر مل سکتا ہے۔ وہ نرسنگ ہوم میں بھی نہیں مل سکتا۔ "

ڈاکٹر نے کہا :

" تو پھر دو نرسیں متعیّن کر لیجیے۔ وہ باری باری سے دن رات تیمارداری کرتی رہیں گی۔ "

قبل اس کے کہ نواب صاحب کچھ جواب دیں۔ ثریّا پھر بیچ میں بول پڑی۔ اس نے کہا :

" نرسوں کی بھی ضرورت نہیں۔ میں اور زبیدہ اچھّی طرح نرسنگ کر لیں گے ابّا حضور ! "

ڈاکٹر صاحب اپنا سا مُنہ لے کر چلے گئے۔ نواب صاحب نے بھی گویا ثریّا کی رائے پر صاد کر دیا۔ اور باہر چلے آئے۔

ثریّا نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ گھڑی کی سوئیاں گھنٹے بدلتی رہیں۔ لیکن ثریّا اپنی جگہ سے نہ ٹلی۔ وہ رات بھر پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ کبھی وہ تھرمامیٹر سے بخار کا اندازہ لگاتی۔ کبھی پاشویا کر کے بخار کو کم کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی نبض ٹٹولتی۔ کبھی کمبل اُڑھاتی۔ کبھی دوا پلاتی۔ غرض ساری رات اس نے اسی طرح کاٹ دی۔

کامل ۲۴ گھنٹے گزر گئے۔ مگر ثریا چٹان کی طرح اپنی جگہ جمی ہوئی

تھی۔ وہ پلک جھپکنا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ بیگم حامد بھی بار بار آتی تھیں۔ دعائیں پڑھ پڑھ کے دم کرتی تھیں۔ زبیدہ بھی رات میں کئی مرتبہ آئی۔ اور ڈیوٹی بدلنے کی کوشش کی، مگر ثریّا نے ذرا بھی توجہ نہ کی۔ کوئی بات نہ مانی۔ اس نے زبیدہ کو رخصت کر دیا، اور خود تیمارداری کے فرائض انجام دیتی رہی۔ زبیدہ نے ایک مرتبہ جل کر کہا:

"اقبال تو اچھے ہو جائیں گے تم مر جاؤگی اس طرح!"

ثریّا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھ کر کہا:

"مرنے دو۔ ہمی تو مریں گے، تمھیں کیا!"

وہ چلی گئی۔ اور ثریّا پھر اپنے محبوب کام میں مشغول ہو گئی۔ جب اس طرح بہت مدّت گزر گئی۔ تو بیگم حامد آئیں۔ انھوں نے شفقت سے ثریّا کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا:

"کیا اپنی جان دے گی بیٹی؟"

"اچھی تو ہوں امّی حضور!"

"بس تو بہت کام کر لیا۔ اب جا کر آرام کر!"

"نہیں امّاں، میں بڑے آرام سے ہوں!"

"تم تھک گئی ہو بیٹی!"

"جی نہیں، میں ذرا بھی نہیں تھکی!"

"کہنا مان لو، اپنی ماں کا۔ ضد نہیں کرتے۔ شاباش کچھ دیر مجھے بھی تو بیٹھنے دو۔ پھر زبیدہ آئے گی۔ اسے بھی یہ کام کرنا چاہیے۔ ہم

دونوں جب چلے جائیں۔ تب پھر چلی آنا۔ شاباش، میری اچھی لڑکی نہیں!"

اب ثریا بے بس ہو گئی، اور مجبور ہو کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ جب وہ جانے لگی۔ تو بیگم نے ماتما سے بے قابو ہو کر کہا:

"بیٹی رات سے تم نے کچھ نہیں کھایا!"

"بھوک نہیں لگی امّاں!"

"اب تو کھا لو!"

"کھا لوں گی، آپ فکرمند نہ ہوں۔"

اتنے میں زبیدہ آگئی۔ بیگم نے اس سے کہا:

"دیکھتی ہو زبیدہ؟ یہ ساری رات جاگی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا اس نے۔ میں یہاں بیٹھی ہوں، تم اسے کچھ کھلا دو۔"

"بہت اچھا، خالہ جان!"

کہہ کر زبیدہ کمرہ سے باہر نکل گئی۔ اور ثریا اپنے کمرہ میں آگئی۔ یہاں جانماز بچھی ہوئی تھی۔ ثریا نے وضو کیا اور دعا مانگنے لگی:

"یا اللہ! اگر جان کا صدقہ جان ہے، تو میری ناچیز جان حاضر ہے۔"

وہ دعا مانگ کر مصلے سے اُٹھ رہی تھی، کہ زبیدہ چائے اور بسکٹ لے کر آگئی:

"لو ذرا سا کھا لو!"

ثریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر بیٹھنے لگی۔ زبیدہ نے کہا:

"اور بسکٹ؟"

"بسکٹ نہیں، صرف چائے پیوں گی!"

"یہ کیوں؟"

"طبیعت ذرا بھاری ہے۔ ایسے میں چائے کافی ہے!"

زبیدہ ثریّا کی مزاج دان اور ادا شناس تھی۔ وہ ثریّا کی کیفیت کو خوب محسوس کر رہی تھی۔ وہ جان رہی تھی۔ اس وقت ثریّا کو چھیڑنا خطرناک ہے۔ مادّہ تیار ہے۔ پھٹ پڑے گا۔ وہ ثریّا کی کیفیت دیکھ کر بھی انجان بنی ہوئی تھی۔ وہ دل و جان سے اسے چاہتی تھی۔ دل میں اس کا حال دیکھ دیکھ کر کراہ رہی تھی۔ لیکن زبان پر ایک حرف نہیں لاتی تھی۔ جب ثریّا نے بسکٹ کھانے سے انکار کیا، تو اسے بڑی تکلیف ہوئی۔ لیکن جانتی تھی۔ ضدّی لڑکی ہے، ہرگز کہا نہیں مانے گی۔ چپ ہو رہی۔

جب ثریّا چائے پی چکی۔ تو زبیدہ چپکے سے اُٹھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر ثریّا کو اس کے بستر پر لٹا دیا۔ چادر اُڑھا کر کہا:

"اب ذرا دیر تم سو رہو۔ دن کو تو میں اور خالہ اقبال کی دیکھ بھال کر لیں گے۔ رات بھر تمھی کو جاگنا ہے۔"

زبیدہ نے یہ الفاظ اس طرح کہے۔ گویا ان میں کوئی غیرت کی بات نہیں ہے۔ ان میں طنز اور چھیڑ چھاڑ نہیں تھی۔ ہمدردی اور تسلّی بھی نہیں تھی۔ بیگانگی کے ساتھ صرف تکمیلِ فرض کا اشارہ تھا۔ اثر حسبِ دلخواہ ہُوا۔ ثریّا نے خاموشی سے زبیدہ کی بات مان لی۔ چُپ چاپ لیٹ گئی۔

اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔

زبیدہ اُس کی یہ حالت ایک کُرسی پر بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ لیکن بالکل انجان بنی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھی۔ ثریا کے قریب گئی۔ چادر ہٹا کر چہرہ دیکھا۔ مُنہ اُترا ہوا تھا۔ گالوں پر آنسوؤں کے بہنے کے نشان تھے۔ لیکن وہ۔ بے خبر سو رہی تھی۔ زبیدہ نے جھک کر چُپکے سے ثریا کی پیشانی چُومی اور کمرہ سے باہر نکلی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت آنسو چھلک رہے تھے۔ لیکن وہ انھیں آنکھوں کے قفس میں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس ثریا کا انجام کیا ہو گا؟ یہ کس طرف جا رہی ہے؟

باب ۱۶

نیا سوال

دو ہفتے کے لگاتار معالجے اور تیمارداری کے بعد، اقبال کی طبیعت رُو بہ اصلاح ہوئی۔ اس عرصہ میں کئی بار اس کی زندگی سے ڈاکٹر، حکیم، نواب صاحب، زبیدہ، بیگم صاحبہ کو مایوسی ہو ہو گئی۔ لیکن ثریّا آس اور یاس سے بے نیاز تھی۔ وہ ہر ذکر سے غافل، اقبال کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے تئیں اس کام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نہ وہ تھکن محسوس کرتی تھی۔ نہ پریشانی۔ کھانا مِلا تو کھا لیا۔ موقع ہوا تو ذرا کے ذرا آنکھ جھپکا لی۔ ورنہ وہ تھی اور اقبال۔

آج اقبال کی طبیعت اور زیادہ اچھی تھی۔ وہ ایک آرام کرسی پر کمبل لپیٹے ہوئے سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے کرسی پر ثریّا بیٹھی تھی۔ ملازمہ چائے لے کر آئی۔ ثریّا چائے بنانے لگی۔ اقبال محبت بھری نظروں سے ثریّا کو دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا، ثریّا نے کس استقلال و مستعدی سے اس کی چارہ سازی اور تیمارداری کی ہے۔ ثریّا نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ ایک ایک گھونٹ کر کے پینے لگا۔ ثریّا نے سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا:

"اب تو آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں خدا کا شکر ہے، اب اچھا ہوں"

وہ مسکرا کر بولی:

"یہاں تو لوگ آپ کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے!"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"سچ پوچھیے، تو مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ اور یہ زندگی آپ نے مجھے عطا کی ہے!"

وہ حیرت سے بولی:

"میں نے؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جی ہاں آپ نے —— رواں رواں آپ کے احسانات سے دبا ہوا ہے۔ کاش میری یہ ناچیز زندگی آپ کے کسی کام آ سکتی!"

ثریا نے متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"آپ تکلف میں بہت بڑھتے جا رہے ہیں!"

اقبال نے جواب دیا:

"تکلف نہیں کرتا، واقعہ عرض کرتا ہوں۔ زندگی کے آخری سانس تک آپ کا احسان نہیں بھول سکتا!"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ انسان کا فرض انسان کی خدمت ہے۔ اور فرض نہ شکریہ کا محتاج ہوتا ہے، نہ صلہ کا۔ خدمت بغیر کسی غرض اور تمنا کے ہونی چاہیئے —— فرض کیجیے، میں اسی طرح بیمار پڑ جاؤں

کیا آپ میری خدمت اسی طرح نہیں کریں گے؟"

" خدا نہ کرے آپ بیمار ہوں۔ ایسی باتیں نہ کیجیئے!"

اقبال باتیں کر رہا تھا۔ اور ثریّا کی نظر اقبال کی انگلی میں اس انگوٹھی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ جو اس نے تحفہ کے طور پر اسے دی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی میری خدمت کا اتنا احساس ہے، اور میرا دیا ہوا تحفہ جو میں نے بڑے چاؤ اور پیار سے دیا تھا اس قابل بھی نہیں تھا کہ احتیاط سے رکھا جاتا۔

اور عین اسی وقت، زبیدہ، شرارت کی پوٹ بنی ہوئی، ہنستی اور مسکراتی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور ان دونوں سے مخاطب ہو کر چہکنے لگی:

" آج تو یہاں کی فضا پھر رنگین دکھائی دیتی ہے؟"

ثریّا نے متبسّم ہو کر پوچھا:

"کیا مطلب؟"

اقبال نے کہا:

" آپ جہاں پہنچ جائیں۔ وہاں رنگینی اور رعنائی کے سوا کیا نظر آ سکتا ہے؟"

" لے اب زیادہ باتیں نہ بنائیے۔ میں جانتی ہوں۔ آپ لوگ چاہتے ہیں، میں چلی جاؤں۔ بہت اچھا صاحب، میں چلی!"

ثریّا نے ٹوکا:

" اے واہ، خواہ مخواہ، آئی ہو تو بیٹھو، لیکن آدمی بن کر، ہر وقت شرارت نہیں اچھی لگتی!"

"شرارت کا نام کیوں لیتی ہو؟ نہ "ہر وقت" کو بدنام کرو۔ صاف صاف کہہ دو" اس وقت" تو اچھی نہیں لگتی، چل بھاگ یہاں سے، میں چلی جاؤں گی۔ فوراً اور کیا! کیوں حضرت اقبال، میں غلط تو نہیں کہتی؟ سچ سچ کہیئے گا۔ دیکھئے مروّت کی سند نہیں!"

"سچ سچ اگر آپ پوچھتی ہیں تو آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں!"

"ثریّا ہنسنے لگی:

"اب کہو؟"

زبیدہ کچھ جھینپ سی گئی، اس نے کہا:

"نا بابا، میں نہیں بیٹھتی۔ گل و بلبل کا ترانہ، چکور اور چاند کی باتیں۔ میں موئی کباب میں ہڈی بن کر کیوں بیٹھوں؟"

ثریّا روٹھ کر بولی:

"تو نہ بیٹھو، جاؤ، لیکن جا بھی چکو کسی طرح۔ نہ جاتی ہو، نہ بیٹھتی ہو۔ کھڑے کھڑے سر کھا رہی ہو مفت میں!"

زبیدہ بیٹھ گئی۔

"اب تو نہیں جائیں گے۔ دیکھیں کوئی ہمارا کیا کر لیتا ہے؟"

وہ بیٹھ گئی، اور ایک کتاب کے ورق الٹنے پلٹنے لگی۔ اقبال نے کہا:

"یہ لائبریری نہیں ہے۔ پڑھنا ہے تو تشریف لے جائیے!"

زبیدہ نے کہا:

"اب تک تو بخار مجھ غریب پر اتر رہا تھا۔ اب کتاب پر بھی نزلہ گرنے لگا؟"

ثریّا نے دریافت کیا،

"کونسی کتاب ہے یہ؟"

"نام بتاؤں گی تو چڑ جاؤ گی!"

اقبال نے کہا:

"آپ تو ہوا سے لڑتی ہیں۔ کتاب کے نام سے اور چڑنے سے کیا تعلق؟ کون سی کتاب ہے؟ قدا ہمیں بھی تو معلوم ہو!"

"جی اس خاکسار کا نام ہے ——"

اقبال نے پھر ٹوکا:

"خاکسار کا نام نہیں، کتاب کا نام دریافت کیا جا رہا ہے۔"

زبیدہ اُٹھ کھڑی ہوئی:

"آپ لوگ یہیں بیٹھے رہیں گے، میں جاتی ہوں ——"

دروازے پر پہنچ کر اس نے کہا:

"اس کتاب کا نام ہے "زہرِ عشق!" میں اسے پڑھتی ہوں، آپ لوگ تصنیف کیجیے! آداب عرض!"

اور وہ بوئے گل کی طرح نکل چلی گئی!

باب ۱۷

ایک اور سانحہ

جب سے اقبال گیا تھا۔ جمال پور میں اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی۔ چودھری امجد علی نے کئی بار شہر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آ گئی کہ نہ جا سکے۔ اُڑتی ہوئی خبر انھیں یہ ملی تھی کہ اب اقبال کی طبیعت پہلے سے اچھی ہے۔ لیکن اس سے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ ان کا محسن تھا۔ اس نے بڑی دل سوزی سے ان کا علاج کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے شہر جائیں۔ دو چار روز اس کے پاس رہیں۔ موقع ملے تو اس کی تیمارداری میں حصّہ لیں۔ یہی سوچ کر آج انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ضرور شہر جائیں گے اپنی آنکھوں سے اقبال کا حال دیکھیں گے اور دو ایک روز اس کے پاس رہ کر واپس آئیں گے۔ لیکن ان کی عدم موجودگی میں حمیدہ کیا کرے گی؟ اس گھر میں اکیلی کیسے رہے گی؟ ایسے موقع پر وہ کلّو کی ماں کو اپنا قائم مقام بنا جاتے تھے۔ اور سچّی بات یہ ہے کہ وہ چودھری صاحب کی عدم موجودگی میں حمیدہ کی نگہداشت ایک باپ کی طرح کرتی تھی۔ نہ اسے کہیں جانے دیتی تھی نہ خود پل بھر کے لیے نکلتی تھی۔

چودھری صاحب بنے ٹھنے حمیدہ کے انتظار میں چلپائی پر بیٹھے حقّہ پی

رہے تھے۔ وہ ان کی حسب ہدایت کلّو کی ماں کو بُلانے گئی تھی لیکن سیدھی نہیں۔ ڈاک خانہ ہوتی ہوئی۔ جب بھی اسے باہر نکلنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ ایک چکر ڈاک خانہ کا ضرور لگاتی تھی۔ شاید اقبال کا کوئی خط آیا ہو۔ لیکن وہ ہمیشہ ناکام واپس آتی تھی۔ ڈاک خانہ کا منشی اسے پہچانتا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی کہہ دیتا تھا:

“نہیں بیٹی، آج بھی کوئی چھٹی نہیں آئی!”

یہ سُن کر جل ہی تو جاتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ اس بڈھے منشی کا مُنہ نوچ لے۔ اور اس چھوٹی سی جھونپڑی میں جسے لوگوں نے ڈاک خانہ کا نام دیا تھا۔ آگ لگا دے۔ اگر اقبال کا خط نہیں آتا، تو اس منشی کی، اور اس ڈاک خانہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟

یہاں سے ہو کر وہ کلّو کے گھر چلی گئی۔ راستہ میں دلاور مل گیا۔ ایک بڑی سی اوکھ ہاتھ میں تھی۔ مُنہ سے توڑتا اور کھاتا جاتا تھا۔ حمیدہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ حمیدہ اسے دیکھ کر رُکی۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دلاور نے پوچھا:

“کہاں جا رہی ہے سواری سرکار کی؟”

کسی اور وقت دلاور نے ایسی شوخ بات کہی ہوتی تو حمیدہ اس کا مُنہ جھُلسا دیتی۔ لیکن اس وقت وہ خاموش ہو گئی۔ وہ دلاور سے لڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اب اتنا بُرا بھی نہیں سمجھتی تھی۔ جتنا پہلے خیال کرتی تھی۔ اب کسی حد تک وہ اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔ اسی لیے اس کی بے تُکی باتوں کو بھی سہ لیتی تھی۔ بولی:

"بابا نے کلّو کی ماں کو بلایا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

دلاور آگے بڑھا۔ حمیدہ نے اسے روکا:

"کہاں چلے سنو تو!"

وہ رُک گیا۔ حمیدہ نے پوچھا:

"شہر گئے تھے؟ تم نے تو وعدہ کیا تھا، جاؤ گے، خیر خبر لاؤ گے!"

دلاور سر کھجانے لگا:

"ہاں بھئی وعدہ تو کیا تھا۔ اور ہم نے اسے پورا بھی کر دیا۔ گئے تھے!"

"کب گئے؟ کب آئے؟"

"پرسوں ہی صبح تو گیا تھا، اور شام ہوتے ہوتے آ گیا تھا!"

"اور مجھے خبر بھی نہیں دی؟"

"خبر کیسے دیتا؟ گھر میں آنے کی مناہی ہے؟ راستے گلی میں تم ملیں نہیں۔ چودھری چچا نہ جانے کب خوش ہوں گے اور گھر میں میرا آنا جانا پھر شروع ہو گا؟"

"ہو جائے گا، میں کہہ دوں گی!"

"تم مجھے اطمینان دے دیتی ہو۔ چچا سے کچھ نہیں کہتیں۔"

"کہہ دوں گی، کہہ دوں گی —— ہاں یہ تو بتاؤ وہ کیسے ہیں؟"

"کون، اقبال میاں؟"

"ہاں وہی اور کون؟ بتاؤ نا!"

"اچھے ہیں، اور کیسے ہیں!"

"تم سے کچھ باتیں ہوئیں؟"

"ہاں بہت ساری!"

"میرا بھی ذکر کرتے تھے کچھ؟"

"یہ لو اور باتیں ہی کیا ہوئیں۔ جب تک بیٹھا رہا، تمھارا کلمہ پڑھتے رہے۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہتے تھے ہر وقت حمیدہ کی تصویر آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے۔ اچھا ہو لوں، تو پھر جمالی پور پہنچوں اور وہیں کا ہو جاؤں!"

وہ شرما گئی۔ ذرا دیر چپ رہ کر بولی:

"کمزور تو بہت ہو گئے ہوں گے!"

"ہاں، کچھ یونہی سے!"

"تم نے کہا کیوں نہیں، چوزے کی یخنی پیا کریں؟"

دلاور ہنسنے لگا:

"اب کے جاؤں گا، تو کہہ دوں گا!"

حمیدہ جانے کے لیے آگے بڑھی اور جاتے جاتے اس نے کہا:

"ضرور کہنا، بھول نہ جانا!"

وہ چلی گئی اور دلاور آگے بڑھا۔ اس نے حمیدہ سے ایک ایک بات جھوٹ کہی تھی۔ وہ نہ شہر گیا تھا، نہ اقبال سے ملا تھا۔ وہ صرف اسے بہلاوا دے رہا تھا۔ اسے یقین تھا، دو چار روز میں حمیدہ اقبال کو بھول جائے گی اور وہ پھر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن آج کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ حمیدہ نہ صرف اقبال کو بھولی نہیں ہے بلکہ اس کی رگ رگ اور نس نس

میں وہ سمایا ہُوا ہے۔ عشق کا رنگ کچھ اور چوکھا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر جلد خبر نہ لی گئی تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ سیدھا چودھری صاحب کے گھر پہنچا کہ آج چھیراں کا دل ٹٹولے اور موقع ہو تو ان سے صاف صاف گفتگو کر لے۔ اسے دیکھتے ہی چودھری صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اُنھوں نے نہ اس کی خیریت پوچھی، نہ بٹھایا۔ حقہ پیتے پیتے پوچھا؛

"کیسے آنا ہُوا؟"

"ایک بڑے ضروری کام سے آیا ہوں چچا!"

"کہو، کیا کام ہے؟"

"میں آج فیصلہ کرنے آیا ہوں؟"

"فیصلہ؟ مجھ سے؟ میرا تمھارا کیا جھگڑا ہے؟"

"جھگڑا تو کچھ بھی نہیں ہے، اور ہے بھی!"

"یہ کیا بات ہوئی؟ نہیں بھی ہے، اور ہے بھی، صاف صاف کہو نا!"

"بات یہ ہے چچا کہ اب میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں!"

"بڑا مبارک خیال ہے! گھر بس جائے گا تو آدمی بن جاؤ گے!"

دلاور نے خوش ہو کر کہا:

"میں بھی آپ کا، حمیدہ بھی آپ کی، جب چاہیے قاضی کو بلا کر فیصلہ کر دیجیے۔"

چودھری صاحب نے ایک زوردار کش لگایا۔ اور دلاور کی طرف گھورتے ہوئے کہا:

"یہ خیال اب تک تمھارے دل میں بسا ہُوا ہے؟"

"چچا یہ خیال تو جان کے ساتھ ہے۔ میں نہ رہوں گا۔ تو یہ خیال بھی نہ رہے گا۔"

"یہ خیال دل سے نکال دو۔ یہ ان ہونی بات ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتی!"

دلاور بھی اڑ گیا:

"کیوں نہیں؟ مجھ میں کون سے کیڑے پڑے ہیں؟ کوئی مائی کا لال ہے جو جمال پور میں میرا مقابلہ کر سکے؟"

"کوئی نہیں، تم بڑے بہادر ہو، بڑے جیالے ہو، لیکن تمھارا اور حمیدہ کا جوڑ نہیں!"

"یہی تو پوچھتا ہوں کیوں نہیں؟"

"وہ پڑھی لکھی ہے، تم جاہل ہو۔ وہ نیک اور شریف ہے، تم آوارہ اور بدمعاش ہو۔ خبردار، اب یہ بات زبان پر نہ لانا!"

"میری زبان پر تالا کوئی نہیں لگا سکتا۔ میں دلاور ہوں۔ میرے آڑے کوئی نہیں آ سکتا۔ میں حمیدہ سے شادی کر کے رہوں گا۔ اسے دلہن بن کر میرے گھر جانا ہی پڑے گا!"

چودھری صاحب کو جلال آ گیا:

"ابے کل کے لونڈے مجھے دھونس دے رہا ہے؟ نکل یہاں سے۔ خبردار جو اب کبھی قدم رکھا، اس گھر میں۔ نالائق، بدمعاش!"

دلاور اور بپھر گیا:

"زبان سنبھال کے بات کرو، بڑے میاں۔ نہیں تو خون کی ندیاں بہ

جائیں گی یہاں!"

"ابے کچھ پی کے آیا ہے؟"

"پی کے تو نہیں آیا ہوں۔ لیکن نشہ میں ہوں۔"

دلاور نے اپنی انٹی سے یہ بڑا چاقو نکال لیا۔ پیچھے ہٹ کر اسے کھولا۔ اور چودھری سے کہنے لگا:

"بولو، اب کیا کہتے ہو؟ حمیدہ سے میرا بیاہ ہوگا یا نہیں؟"

"ہرگز نہیں؟"

"پھر سوچ لو، چچا!"

خوب سوچ لیا، تو مجھے ڈرا کر کام نکالنا چاہتا ہے؟ یہ نہیں جانتا میں کون ہوں؟"

"خوب جانتا ہوں۔ اور اسی لیے آج فیصلہ کر کے جاؤں گا، لو سنبھلو!"

اور قبل اس کے کہ چودھری سنبھلے۔ دلاور کے لمبے چاقو کا پورا پھل اس کے سینہ میں پیوست ہو چکا تھا۔ وہ پیٹھ کے بل چارپائی پر گرا۔ اور آہ کر کے ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ بوڑھا اور کمزور آدمی تھا۔ اتنا بڑا گھاؤ، وہ بھی سینہ پر کیسے سہتا۔

دلاور نے جلدی سے چاقو نکالا۔ اسے چودھری کے کپڑوں سے پونچھا۔ اور پھر احتیاط سے اپنی انٹی میں رکھ لیا۔ وہ بھاگنے کے ارادے سے دروازے کی طرف لپکا تھا کہ کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دلاور دروازہ کی آڑ میں ہو گیا۔ حمیدہ کلو کی ماں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ یہ جگر خراش منظر دیکھ کر دونوں کے

مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ حمیدہ باپ کی لاش سے لپٹ کر بےہوش ہوگئی اور کلّو کی ماں کچھ دیر تک تو سکتہ میں رہی۔ یہ کیا ہو گیا۔ پھر اس نے چھاتی کوٹنا اور چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ دلاور موقع پاتے ہی رفو چکر ہو گیا۔ کلّو کی ماں کی واویلا سن کر گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ان لوگوں میں دلاور بھی تھا۔ اور سب سے زیادہ مغموم وہی نظر آ رہا تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ آخر چودھری اس کا "چچا" تھا۔ حمیدہ نے ہوش میں آنے کے بعد اسے دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کسی بڑے غم میں کوئی ہمدرد نظر آ جائے تو آنکھیں ضرور بہہ نکلتی ہیں۔ یہی حال اس وقت حمیدہ کا ہُوا۔ اس نے دلاور سے روتے روتے پوچھا:

"یہ کیا ہو گیا میرے اللہ!"

دلاور آگے بڑھا۔ اس نے حمیدہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"بہت بُرا ہُوا۔ لیکن تو روتی کیوں ہے؟ میں جو زندہ ہوں۔ چچا کی لاش اُٹھنے دے۔ پھر دیکھ ان کے قاتل کو میں ڈھونڈھ نکالتا ہوں یا نہیں؟ میرا نام دلاور ہے۔ وہ سالا بھاگ کے جائے گا کہاں؟"

سب لوگ سہم گئے۔ واقعی دلاور سے کون آنکھ لڑا سکتا تھا۔ وہ سارے گاؤں کے غنڈوں کا سردار تھا۔ خود بھی پورا پہلوان تھا۔ سب کو حیرت تھی چودھری ایسے نیک اور شریف آدمی کو قتل کرنے والا کون ہے؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟

باب ١٨

نیا سابقہ

اقبال کا معمول تھا، کہ وہ صبح کا ناشتہ نواب صاحب کے ساتھ کرتا۔ کچھ دیر ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔ پھر گھر میں واپس چلا آتا۔ یہاں کچھ دیر وہ ثریّا، یا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ پھر اپنے کمرہ میں چلا جاتا۔ وہاں مطالعہ میں مصروف و منہمک ہو جاتا۔ آج بھی وہ اپنے معمول کے مطابق نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ ناشتہ دونوں نے ساتھ ساتھ کیا۔ پھر مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ آج نواب صاحب اقبال کی طرف زیادہ مائل تھے۔ روز تو وہ ناشتہ سے فارغ ہو کر اپنے مصاحبوں کے جمگھٹ میں پہنچ جاتے۔ اور شطرنج یا گنجفہ شروع کر دیتے۔ آج وہ مصاحبوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوئے۔ حقّہ سامنے رکھا تھا۔ اس سے شغل کرنے لگے۔ اقبال حسب معمول خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے کہا:

"کہو بیٹے! اب طبیعت کیسی ہے؟"

"اب تو خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہوں!"

"لیکن ابھی کچھ کمزوری باقی ہے؟"

"جی ہاں، تھوڑی بہت کمزوری تو ہے انشاءاللہ یہ بھی جاتی رہے گی!"

"ہوں! —— ہاں یہ تو بتاؤ، اب مطب کرنے کا ارادہ ہے یا ابھی اور مزید تعلیم حاصل کرنی ہے؟ اگر تم چاہو تو میں تمھیں انگلینڈ بھیج دوں؟"

اقبال کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ یہ اس کی دیرینہ آرزو تھی کہ وہ یورپ جائے، وہاں کی ڈگری لائے۔ وہاں کے ہسپتالوں کا معائنہ کرے۔ وہاں کا طریقِ علاج دیکھے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر رہ جاتا تھا۔ نواب صاحب کے احسانات ویسے ہی مجھ پر کیا کم ہیں۔ انھوں نے مجھے خاک سے پاک کر دیا۔ ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ کس برتے اور کس استحقاق کی بنا پر میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یورپ بھیج دیں۔ لیکن آج تو نواب صاحب خود ہی کہہ رہے تھے۔ پھر وہ اس نادر اور بیش بہا موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتا؟ اس نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا:

"ہاں کچھ عرصے کے لیے جا سکوں تو میرا فن بالکل مکمل ہو جائے!"

نواب صاحب نے بڑی محبت کے ساتھ کہا:

"بیٹے، یہ بات تھی تو تم نے خود کیوں نہیں مجھ سے کہا۔ بالکل اتفاق تھا کہ یہ بات میرے ذہن میں آ گئی!"

اقبال نے سر جھکا لیا اور خاموش رہا۔ نواب صاحب نے پوچھا:

"جواب دو اقبال!"

اقبال نے کہا:

"مجھے اپنی حقیقت یاد ہے۔ میں کچھ نہ تھا۔ لیکن آپ نے مجھے سب کچھ بنا دیا۔ اب کہاں تک آپ کی شفقت و سخاوت ——

نواب صاحب بات کاٹ کر بولے:

"اب تک تمھارے دل میں مغائرت ہے؟ بیٹے یہ سب کچھ کس کا ہے؟ کیا تمھارا نہیں؟ میرے پاس جو کچھ ہے سب تمھارا ہے۔ تم کو میں نے اپنا کر اپنا سب کچھ تمھیں دے دیا۔ تمھارے ان الفاظ نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ تم مجھے اپنا صرف محسن سمجھتے ہو۔ بزرگ اور عزیز نہیں؟"

"یہ نہ فرمائیے۔ آپ کے سوا میں اور کسے اپنا سمجھ سکتا ہوں؟ اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد، آپ ہی کے دامنِ محبت میں پناہ پائی۔ اور آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں پھلا، پھولا۔ آپ کے سوا، میرا دُنیا میں ہے کون؟"

"اگر تمھیں کوئی تکلیف ہو تو کہو۔ میرا خیال ہے۔ بیگم بھی تمھیں اولاد سے کم نہیں سمجھتیں!"

"بجا ارشاد ہُوا۔ اور میں بھی انھیں اپنی ماں سے زیادہ سمجھتا ہوں!"

"یہی ہونا چاہیئے۔ اچھا اب تم سفر کی تیاری کرو۔ اور جب چاہو انگلستان روانہ ہو جاؤ۔ میری طرف سے تمھیں پوری اجازت ہے!"

اقبال کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ میں جواب دیا:

"بہت خوب!"

اتنے میں بشیر خاں ہانپتا کانپتا پہنچا اور نواب صاحب کے سامنے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اقبال اور نواب صاحب دونوں گھبرا گئے۔ اقبال نے پوچھا:

" کیا ہوا شیر خاں ؟ "

نواب صاحب نے باوقار انداز میں سوال کیا :

" روتے کیوں ہو ؟ خیریت تو ہے ؟ "

شیر خاں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا :

" خیریت کہاں میرے سرکار۔ جمال پور یتیم ہو گیا۔ ہم سب کا باپ ––"

" تم چودھری امجد علی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو ؟ "

" جی حضور ! "

" کیا ہوا انھیں ؟ "

" مار ڈالا اس فرشتے کو، کسی مورکھ نے ! "

اقبال اور نواب صاحب دونوں یہ خلاف توقع خبر سن کر چونک پڑے دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا :

" مار ڈالا ؟ "

" جی سرکار ! "

نواب صاحب نے انتہائی صدمہ اور برہمی کے عالم میں پوچھا :

" کیوں ؟ کس نے ؟ "

" کیا جانے کس نے ؟ میرے سرکار، وہ تو فرشتہ تھا۔ اس کا بھی کوئی دشمن تھا۔ یہ تو اب معلوم ہوا۔ "

نواب صاحب نے گرجتے ہوئے کہا :

" قاتل نے چودھری کو نہیں ہمیں قتل کیا ہے۔ ہم سارے گاؤں کا

تختہ اُلٹ دیں گے۔ لیکن قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر رہیں گے۔ وہ ہمار وفادار ملازم تھا۔ اسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ خادم کے درجہ سے بڑھ کر ہمارا دوست اور بھائی بن چکا تھا۔ شاید ہماری نگاہ میں اس کی بڑھتی ہوئی عزت دیکھ کر کچھ لوگ اس کے خون کے پیاسے ہو گئے؟"

"یہی بات ہے حضور!"

"حمیدہ کا کیا حال ہے؟"

"رو کر بے حال ہوئی جا رہی ہے سرکار، اس کی تو صورت نہیں دیکھی جاتی۔ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے! ہائے کیا تھا کیا ہو گیا!"

"جس بستی میں اس کے باپ کے قاتل بستے ہوں، وہاں ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم خود تعزیت کے لیے اس کے پاس جائیں گے، اور اسے یہاں لائیں گے!"

نواب صاحب، شیر خاں کے ساتھ جمال پور گئے۔ اقبال بدستور اپنی جگہ پر مغموم و متفکر بیٹھا رہا۔ چودھری کا قتل اس کے لیے ذاتی حادثہ تھا۔ کتنی محبت کرتا تھا وہ بوڑھا، اس نوجوان کے ساتھ اور حمیدہ؟ اس تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کی کیا حالت ہو گی؟ وہ کیا کر رہی ہو گی؟ میں نے ایک خط بھی جب سے آیا ہوں نہ لکھا۔ اب میں اس سے تعزیت کس طرح کروں گا؟ تسلی کیوں کر دے سکوں گا؟ لیکن نہیں، وہ یہاں آ رہی ہے۔ میں اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ دوں گا۔ میں اس کے زخمِ دل پر پھاہا رکھوں گا۔ میں اپنی چاہ اور محبت سے اس کے صدمہ اور غم کو

دور کر دوں گا۔ وہ مجھے پاکر سب کچھ بھول جائے گی۔ میں اُسے پاکر سب کچھ حاصل کر لوں گا۔ لیکن وہ یہاں آ رہی ہے، اور میں انگلستان جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے میرے بعد وہ کیا کرے گی۔ یہاں کے لوگ لاکھ ہمدرد اور شریف سہی، لیکن ان کے سینے میں اقبال کا دل تو نہیں ہے۔ وہ اس سے شفقت و محبّت کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ ہمدردی اور سلوک کر سکتے ہیں، لیکن اس کا غم نہیں بانٹ سکتے۔ اس کے شریکِ غم نہیں بن سکتے۔ یہ کام صرف میرا ہے۔ اسے صرف میں انجام دے سکتا ہوں۔ نہیں، میں انگلستان نہیں جاؤں گا۔ انگلستان کا جانا۔ بڑی بڑی ڈگریوں کا لینا اتنا ضروری نہیں ہے۔ جتنا حمیدہ کا دل رکھنا، اسے تسلّی دینا، اس کے غم میں حصّہ لینا!"

یہی سوچتا ہوا، اقبال اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اندر گیا اور ثریّا کی لائبریری کے سامنے سے گزرا۔ وہ اس وقت یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظر چار ہوئی۔ اقبال ادھر سے گزر کر اپنے کمرہ میں چلا جانا چاہتا تھا۔ لیکن ثریّا کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ثریّا نے کہا:

"کہاں جا رہے ہیں؟ آئیے!"

"وہ خاموشی سے آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ثریّا نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟ آپ اتنے پریشان کیوں نظر آتے ہیں؟"

اقبال نے سنبھل کر کہا:

"کچھ بھی نہیں —— چودھری امجد علی قتل کر ڈالے گئے!"

یہ سن کر ثریّا بھی مبہوت ہو گئی:

" چہ چہ۔ قتل کر ڈالے گئے؟ کیسے ؟ "

" یہ تو ابھی معلوم نہ ہو سکا۔ نواب صاحب تحقیق احوال کے لیے جمال پور تشریف لے گئے ہیں! "

" ایسے نیک آدمی کا بھی کوئی دشمن ہو سکتا ہے؟ تعجّب ہے! "

" واقعی سمجھ میں نہیں آتا کیا ماجرا ہے؟ "

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر ثریّا نے کہا:

" مَیں نے سُنا ہے آپ انگلستان جا رہے ہیں؟ "

اقبال نے عالمِ خیال سے سر اُٹھایا:

" جی کیا فرمایا آپ نے؟ "

ثریّا پھول کی طرح مسکرا دی۔ اس نے کہا:

" آپ اس وقت یہاں نہیں ہیں شاید؟ "

اقبال جھینپ گیا۔ اس نے بات بناتے ہوئے کہا:

" جی ہاں، اس وقت میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ "

" مَیں پوچھتی ہوں، آپ انگلینڈ جا رہے ہیں نا؟ "

" آپ کو کیسے معلوم ہُوا؟ "

" رات ابّا حضور، امّی جان سے کہہ رہے تھے۔ میں اقبال کو ولایت بھیجوں گا ڈگری لینے کے لیے! "

" جی ہاں فرمایا تو اُنھوں نے مجھ سے بھی تھا ——— لیکن شاید اب نہ جا سکوں۔ کم از کم فی الحال نہ جا سکوں! "

ثریّا نے حیرت کے ساتھ پُوچھا:

"کیوں؟ —— ترقّی کا اتنا بڑا موقع آپ کھو دیں گے؟"

اقبال ذرا سنبھلا۔ وہ ثریّا کے سامنے کس طرح کہہ سکتا تھا کہ حمیدہ اُجڑی ہوئی اور لُٹی ہوئی آ رہی ہے، مجھے اس کا سہارا بننا ہے۔ مجھے اس کا ٹوٹا ہُوا دِل جوڑنا ہے۔ اسے چھوڑ کر میں کس طرح جا سکتا ہوں؟ انگلینڈ تو انگلینڈ اسے تنہا چھوڑ کر میں جنّت میں بھی جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ باتیں ثریا کے سامنے کہنے کی نہیں تھیں۔ اس نے کہا:

"میرا مطلب یہ ہے کہ جب تک میری صحت عود نہ کر آئے، کیونکر جا سکتا ہوں؟"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن انتظام کرتے کرتے بھی تو تین مہینے لگ جائیں گے!"

"جی ہاں، یہی میرا مطلب تھا۔ دو تین مہینے کے بعد جاؤں گا!"

LIBRARY

باب ۱۹

دل ہی دل میں

حمیدہ ایک غم کدہ سے نکل کر، دوسرے غم کدہ میں آگئی جمال پور میں باپ کی بے حسی کی ہلاکت کا، دل دوز نقشہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ کوئی تسلی دینے والا نہ تھا۔ خدا کے سوا کسی کا سہارا نہ تھا۔ پھر جب وہ نواب صاحب کے ساتھ ان کے عالی شان محل میں پہنچی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اس کے ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈھ رہی تھیں وہ اقبال کے سوا کوئی اور نہ تھا! یہاں وہ بڑی امیدوں کے ساتھ آئی تھی۔ باپ کی موت نے زندگی کی تاریخ کا ایک باب ختم کر دیا تھا اور اقبال کی نگاہوں کا مرکز بن کر ایک ہی مکان میں رہنے کے ولولہ نے ایک نیا، اور نہایت دلچسپ باب شروع کر دیا تھا۔ راستہ ہی میں اس نے طے کر لیا تھا۔ کہ اب وہ باپ کے غم کو اقبال کی دلداریوں کے ہجوم میں بھول جائے گی۔ آخر سب کے باپ ہمیشہ تو نہیں جیتے رہتے ایک نہ ایک دن انھیں مرنا ہی ہوتا ہے۔ اسے یقین تھا۔ اقبال کی الفت اور محبت اس کی زندگی کو شادمانی، اور مسرت کے نور سے جگمگا

دے گی۔

لیکن نواب صاحب کا محل اس کے لیے اور زیادہ ہولناک ثابت ہوا۔ یہاں اقبال تھا۔ لیکن بدلا ہوا۔ اس کی آنکھیں تھیں لیکن ان سے پریم اور محبّت کی تراوش نہیں ہوتی تھی۔ بیگانگی اور بیزاری ٹپکتی تھی۔ باپ کا غم تو اس نے کسی نہ کسی طرح سہ لیا تھا۔ کیا اقبال کی بے رخی کا غم بھی وہ سہ لے گی؟

وہ بار بار سوچتی تھی، یہ انقلاب کیوں؟ یہ تغیر کس لیے؟ کیا میں بدصورت ہو گئی؟ کیا میری سیرت بدل گئی؟ کیا میں اقبال کے قابل نہیں رہی؟ اگر ہاں، تو کیوں؟ اگر نہیں تو، اقبال مجھ سے ملتا کیوں نہیں؟ باتیں کیوں نہیں کرتا؟ میرے دل کے زخموں پر پھاہا کیوں نہیں رکھتا؟ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑتا کیوں نہیں؟ میرے دل کے ویرانے کو آباد کیوں نہیں کرتا؟ یہ وہی اقبال تو ہے جو میرا کلمہ پڑھا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ دیکھ کر جیا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا۔ حمیدہ تمھارے بغیر جنّت بھی جہنّم ہے، اور آج میں اس کے پاس موجود ہوں۔ مگر وہ میرے غم کدہ میں جھانکتا بھی نہیں۔

ہاں میں سمجھ گئی۔ اقبال اب مجھ سے نہیں ثریّا سے محبّت کرتا ہے کیا میں دیکھتی نہیں۔ ہر وقت کے قہقہے اور چہچہے، ہنسی مذاق۔ اور یہ زبیدہ تو مجھے اچھی خاصی کٹنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں کیوں جلوں؟ ٹھیک تو ہے، میرا اور ثریا کا کیا مقابلہ؟ وہ حسن کی رانی ہے، پڑھے

باپ کی بڑی بیٹی ہے۔ سونے اور جواہرات کی گود میں پلی اور بڑھی۔ اقبال اسے پا کر سب کچھ پا لے گا۔ یہ عالی شان محل، یہ عظیم الشان جاگیر، یہ روپے سے بھرا ہوا خزانہ، یہ موٹر، یہ گاڑیاں، یہ شان، یہ عزت۔

یہ سب چیزیں جمال پور کی ایک غریب چھوکری حمیدہ کو بیاہ لینے کے بعد چھن جائیں گی۔ اور ثریا کو پا لینے کے بعد مل جائیں گی لیکن جب یہ سب کچھ تھا تو مجھے دھوکا کیوں دیا؟ مجھ پر محبت کا جال کیوں پھینکا؟ میں نے غلطی کی جو اقبال کی محبت پر یقین کر لیا۔ اور اب اس غلطی کو مجھے بھگتنا ہے۔

اور اقبال دل ہی دل میں حمیدہ کو دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے حمیدہ کی انگلی میں وہ انگوٹھی دیکھی، جو دلاور نے اس کو دی تھی۔ اور یہ انگوٹھی دہکتے ہوئے انگارے کی طرح اس کے دل پر گری۔ کیا محبت اتنی ناپائدار ہے؟ اتنی مختصر سی مدت میں حمیدہ مجھے بھول گئی۔ اور دلاور کا کلمہ پڑھنے لگی؟ میں کچھ نہ رہا۔ اور دلاور سب کچھ ہو گیا؟ میری وفاداریاں فراموش ہو گئیں اور دلاور کا سکہ چلنے لگا۔ پھر آخر محبت کا ڈھونگ رچانے کی ضرورت کیا تھی؟ یہاں تشریف فرما ہونا کیا ضرور تھا؟ صرف مجھے جلانے کے لیے۔ یہ بتانے کے لیے کہ دیکھ ہم نے تجھے اپنا بنا کر چھوڑ دیا۔ اور دلاور کو چھوڑ کر پھر اپنا بنا لیا؟ یہی سہی مجھے بھی کوئی پروا نہیں بغیر حمیدہ کے میں مر نہیں جاؤں گا۔

دونوں کے دل ایک دوسرے سے بدگمان تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے۔ نظریں ملتی تھیں، لیکن جھک جاتی تھیں۔ اسی طرح کافی مدت گزر گئی۔ ایک روز رات کو موقع پاکر، اقبال حمیدہ کے کمرہ میں گیا۔ آج وہ اس ذہنی اور دماغی کشمکش کا فیصلہ کر لینا چاہتا تھا۔ جس نے زندگی وبال کر دی تھی۔ حمیدہ کسی سوچ میں اپنے پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں انگوٹھی والا ہاتھ رکھا تھا۔ اقبال کو دیکھ کر وہ چونک پڑی سنبھلی اور الگ ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اقبال نے اسے دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ انگوٹھی پر پڑی۔ اس کا چہرہ غصّہ سے لال ہو گیا۔ لیکن وہ ضبط کر گیا۔ حمیدہ نے اسے دیکھ کر کہا:

"آہا، آپ ہیں؟"

اقبال خاموش رہا۔ حمیدہ بولی:

"کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے آپ!"

اقبال نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ حمیدہ کی زبان آج قینچی کی طرح چل رہی تھی:

"کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟"

اقبال نے کہا:

"حمیدہ یہ باتیں رہنے دو۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں!"

وہ بولی:

"کیا بات ہے فرمائیے؟"

اقبال نے ایک تاثر کے عالم میں کہا:

"میں تمھارے ہاں سے ایک بڑی قیمتی چیز لے کر آیا تھا۔ وہ تھی تمھاری یاد، اور پاک محبّت۔ میں وہاں اپنی سب سے قیمتی چیز چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ تھا میرا دل۔ تمھاری محبّت سے میں اب تک سرشار ہوں۔ بتاؤ، میرے دل کا کیا حال ہے؟ وہ ہے بھی یا نہیں؟"

حمیدہ بڑے صبر سے اقبال کی باتیں سنتی رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ اس نے اپنے تئیں سنبھالا۔ اور کہا:

"ہم غریبوں کے دل میں صرف غم رہتا ہے۔ ہمارا دل کسی اور کے دل کا کاشانہ نہیں بن سکتا۔ ہم اتنے اونچے نہیں اڑ سکتے کہ چاند کو پکڑنے کی کوشش کریں!"

اقبال خاموش تھا، اور حمیدہ کہہ رہی تھی:

"آپ نے یہ باتیں کرکے میرے دل میں ہلچل کیوں مچا دی؟ میرے دل کی ناؤ، غم کے سمندر میں ڈوب رہی تھی۔ آپ اس کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھنے کیوں آ گئے؟ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا۔ آپ کو میری بے کسی پر طعن کرنے کا کیا حق ہے بتائیے؟ —————— بتائیے؟ آپ خاموش کیوں ہیں؟ میں نے آپ سے محبّت کی بھیک نہیں مانگی تھی؟ آپ خود ہی بڑے چاؤ سے اپنے دل کی کشتی میں

محبت کا تحفہ سجا کر پہنچے تھے۔ پھر آپ بدل گئے۔ میری سادہ لوحی نے اسی طرح شکست کھائی جس طرح غریب امیر کے سامنے مات کھا جاتا ہے ــــ

حمیدہ ابھی کچھ اور کہتی۔ لیکن اقبال نے بات کاٹ لی، اور کہا:

"حمیدہ، تم مجھے غلط نہ سمجھو۔ میرے دل میں وہی آگ سلگ رہی ہے جو پہلے سلگ رہی تھی۔ میں نہیں بدلا، تم بدل گئی ہو!"

حمیدہ نے پوچھا:

"میں؟ میں بدل گئی ہوں؟"

وہ جوش کے ساتھ بولا:

"ہاں تم، تم بدل گئی ہو ــــــــــــ تم اب میری نہیں کسی اور کی ہو گئی ہو۔"

حمیدہ نے غصّے سے کہا:

"خاموش! ــــ آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ اور میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آپ بھاگنے کے لیے راستہ ڈھونڈھ رہے ہیں میں اگر کسی اور کی بنتی تو ضرور آپ کو بتا دیتی۔ اتنی اخلاقی جرأت مجھ میں ہے۔ میں صرف آپ کی تھی۔ جب آپ ہی ساتھ نہ دے سکے تو میں کس کی ہو سکتی ہوں؟ میں بار بار دھوکہ کھانا نہیں چاہتی۔ بار بار اپنے دل کے ٹکڑے کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے آپ نے بہت اچھا سبق دیا ہے۔ اور میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں

کہ آپ نے مجھے ٹھکرا کر سنبھلنے کا موقع دیا ــــ

اقبال نے پھر حمیدہ کی بات کاٹ لی اور بڑی نرمی سے کہا:

"جس نے تمھیں یہ انگوٹھی دی ہے کیا تم اس کی بھی نہیں بن سکتیں؟"

حمیدہ بولی:

"وہ انگوٹھی دینے والا کون ہے؟ کیا آپ نہیں؟ آپ نے مجھے ٹھکرا دیا مطمئن رہیئے بار بار میں آپ کا دامن نہیں پکڑوں گی۔"

اقبال نے پوچھا،

"یہ انگشتری میں نے دی تھی تمھیں؟"

حمیدہ نے روٹھے ہوئے لہجہ میں کہا:

"جی نہیں مجھے راستہ میں پڑی مل گئی تھی ــــ کیا آپ نے نادر کے ہاتھ اپنا یہ تحفہ نہیں بھیجا تھا؟ مکر جائیے۔ یہ آپ جیسے لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہ لیجیئے اپنی انگوٹھی، بہت بہت شکریہ کے ساتھ!"

حمیدہ انگوٹھی اُتارنے لگی۔ اب اقبال سمجھ گیا۔ اصل معاملہ کیا ہے؟ اس نے بے ساختگی کے عالم میں حمیدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا:

"یہ نہیں ہو سکتا!"

حمیدہ نے ایک ادائے خاص سے اس کی طرف دیکھا۔ اور کہا:

"کیوں؟ کچھ حکومت ہے آپ کی؟"

اقبال نے کہا:

"نہیں التجا ــــ میں تمھیں غلط سمجھا تھا۔ مجھے معاف کردو۔ یہ

دلاور کی حرکت ہے [illegible] سے زیادہ شریف ہے۔ یا حد سے زیادہ شیطان۔ نہیں وہ شریف نہیں ہو سکتا۔ وہ شیطان ہے۔ اس نے انگوٹھی دے کر، میرا نام استعمال کر کے تمھیں پرچانے کی کوشش کی۔ ورنہ یہ انگوٹھی تو میں نے اسے دی تھی۔ کہ ہمارا راز افشانہ کر دے!"

اقبال نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی، حمیدہ کو پہنا دی۔ لیکن حمیدہ کی آنکھوں سے بڑے بڑے آب دار موتی ٹپک رہے تھے۔ اقبال نے جیب سے رومال نکال کر یہ موتی سمیٹنے چاہے۔ لیکن حمیدہ نے اقبال کے ہاتھ سے رومال لے لیا اور خود اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اس رومال پر ثریا نے اپنے ہاتھ سے اقبال کا نام کاڑھ کر بڑے چاؤ سے پیش کیا تھا۔ اور اس نے بڑے شوق سے یہ تحفہ قبول کیا تھا۔

دونوں کے دل صاف ہو گئے۔ آنکھوں سے پھر محبت کی برکھا ہونے لگی۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا!

باب ۲۰

تعجب

ثریّا، یوں تو گھر میں سب کا بہت خیال کرتی تھی۔ لیکن حمیدہ کی شرافت، سادگی اور معصومیت نے اس کا دل موہ لیا تھا۔ واقعی وہ اسے بہن کی طرح چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی، اس یتیم لڑکی کا دل دُکھا ہُوا ہے۔ اس کی دنیا اُجڑ چکی ہے۔ خدا کی اس وسیع دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے، جسے یہ اپنا کہہ سکے۔ اس لیے وہ حمیدہ پر زیادہ سے زیادہ لطف و کرم کی بارش کر رہی تھی۔ اپنے تمام پروگراموں میں وہ اسے شریک رکھتی تھی۔ کوئی جلسہ ہو، تو ثریّا کے ساتھ حمیدہ کا ہونا ضروری تھا۔ سینما کا پروگرام بنے، ناممکن تھا کہ حمیدہ اور ثریّا ساتھ ساتھ نہ ہوں۔ کوئی تقریب ہو، ثریّا سائے کی طرح حمیدہ کو ساتھ رکھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کے دل سے باپ کا غم دُور جائے۔ یہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھے۔ اور مسرّت و عافیت کی زندگی بسر کرے۔

خود حمیدہ کی یہ کیفیّت تھی۔ کہ ثریّا کی بے پناہ نوازشوں نے اسے بندۂ بے دام بنا لیا تھا۔ امیروں کے ساتھ رہنے کا اسے اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ لیکن اس نے پاس سے اور دور سے، امیروں کو دیکھا تھا اور ان کی

نخوت و رعونت دیکھ کر وہ ان سے نفرت کرنے لگی تھی، انھی سے نہیں، اس سارے طبقہ کو وہ بُرا سمجھنے لگی تھی۔ جب نواب صاحب اسے لینے جمال پور پہنچے تو وہ بہت متاثر ہوئی۔ کیونکہ یہ سلوک قطعاً خلافِ توقع تھا۔ لیکن وہ ڈرتے ڈرتے اس محل میں آئی۔ موٹر میں بیٹھی۔ وہ راستے بھر سوچتی رہی۔ دیکھئے، اس گھر میں کیسی گزرتی ہے؟ بیگم صاحبہ کا سلوک کیسا ہوتا ہے؟ ان کی لڑکی ثریا کس طرح پیش آتی ہے؟ وہ غریب تھی۔ لیکن عزتِ نفس کی دولت سے محروم نہ تھی۔ وہ سوچتی تھی اگر میرے ساتھ ذلت بخش برتاؤ کیا گیا تو میں کیا کروں گی؟ اس دنیا میں اب میرا کون ہے؟ لیکن جب وہ نواب صاحب کے محل میں پہنچ گئی تو ثریا کے حسنِ اخلاق، حسنِ سلوک اور اچھے برتاؤ کو دیکھ کر وہ اسے دل ہی دل میں پوجنے لگی۔ اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اس دولت مند گھرانے میں وہ اس طرح ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ نواب صاحب اتنا خیال کریں گے۔ بیگم صاحبہ اتنا چاہیں گی۔ اور ثریا سچ مچ اس کی بہن بن جائے گی۔ سگی بہن سے بھی زیادہ چاہنے لگے گی۔ وہ گھر میں ایک یتیم، بے بس اور بے سہارا لڑکی کی طرح نہیں، نواب زادی کی طرح رہے گی۔ لیکن یہ ان ہونی بات ہو کر رہی۔ اور وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئی کہ امیروں میں بھی اچھے اور بُرے سب ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ سب کے سب بُرے نہیں ہوتے۔

رات بڑی دیر تک اقبال سے وہ باتیں کرتی رہی ان باتوں سے اس کے

دل کا بوجھ اُتر گیا۔ اقبال کے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ اس لیے نہیں آئی کہ اب وہ پھر مستقبل کا اُجڑا دیار آباد کر رہی تھی۔ اقبال کی کج مہری نے اس کے دل کو امیدوں اور آرزوؤں سے خالی کر دیا تھا۔ اگر ثریّا کی نوازشیں اسے زندہ رہنے پر مجبور نہ کرتیں۔ تو شاید وہ خودکشی کر لیتی۔ لیکن آج اقبال نے اس کی لُٹی ہوئی دولت پھر واپس کر دی تھی۔ اب پھر زندہ رہنے کو اس کا جی چاہنے لگا تھا۔ اب پھر اس کے دل میں اُمنگیں انگڑائیاں لینے لگی تھیں۔ اقبال نے پھر اسے ایک نئی دنیا بخش دی تھی۔ اور کتنی پیاری اور دلربا، کیسی رنگین اور بہار اندر بہار تھی یہ دنیا!

صبح اس کی آنکھ دھوپ چڑھے کھُلی۔ سورج جگمگا رہا تھا۔ اور اس کی ننھی کرنیں، اس کے کمرے کو منوّر کر رہی تھیں۔ لیکن اس سُورج کے ساتھ ایک اور سورج بھی چمک رہا تھا۔ وہ تھا نئی اُمیدوں، نئی اُمنگوں کا سورج!

حمیدہ نے جلدی جلدی وضو کیا۔ اور قضا نماز ادا کرنے لگی۔ ثریّا اپنے کمرہ میں ناشتہ پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بغیر حمیدہ کے وہ لقمہ بھی نہیں توڑتی تھی۔ زبیدہ نے کہا:

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتہ کیوں نہیں کرتیں؟"

ثریّا نے کہا:

"بڑی چٹو ہو، کرو ناشتہ، کس نے منع کیا ہے تمہیں؟"

زبیدہ نے پوچھا:

"اور تم؟"

ثریّا بولی:

"ہم تو حمیدہ کے ساتھ چائے پئیں گے!"

زبیدہ نے جل کر کہا:

"اونھ یہ چونچلے۔ اور بوڑھے غمزے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ایسی ہی چاہ ہے تو جاؤ ہاتھ پکڑ کر لے آؤ نواب زادی حمیدہ بیگم کو۔"

زبیدہ ناشتہ کرنے لگی۔ ثریّا مسکراتی ہوئی جھپ سے اٹھی:

"چلتے ہیں لے آئیں گے۔ اپنی حمیدہ کو، تم کیوں جلتی ہو اس سے؟"

"پہلے ناشتہ پھر باتیں!"

ثریّا حمیدہ کے کمرے میں پہنچی۔ وہ نماز ختم کر چکی تھی۔ اور مصلّے پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ ثریّا خاموشی سے آ کر حمیدہ کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ تکیہ کے پاس ایک رومال پڑا تھا۔ اس نے یونہی اٹھا لیا۔ اور دیکھتے ہی چونک پڑی۔ یہ وہی رومال تھا۔ جو اس نے بڑے چاؤ سے کاڑھ کر اقبال کو دیا تھا اور جسے وہ رات یہاں بھول گیا تھا۔ ثریّا دل ہی دل میں سوچنے لگی، یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ رومال حمیدہ کے پاس کیسے پہنچا؟ میں نے تو کبھی حمیدہ کو اقبال سے یا اقبال کو حمیدہ سے باتیں کرتے نہیں دیکھا۔ پھر؟ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ حمیدہ مصلّے سے اٹھی۔ ثریّا نے جلدی سے رومال چھپا لیا۔ حمیدہ نے سامنے آ کر ادب سے ثریّا کو سلام کیا۔ اس نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

اور پوچھا:

"یہ بے وقت کی نماز کیسی؟"

حمیدہ نے جواب دیا:

"صبح آنکھ دیر سے کھلی تھی!"

ثریا نے پھر سوال کیا:

"نیند نہیں آئی رات؟"

"رات بھر!"

"رات بھر؟ لیکن کیوں؟"

حمیدہ مسکرا دی۔ اور زندگی میں پہلی مرتبہ، ثریا کو حمیدہ کی یہ مسکراہٹ زہر معلوم ہوئی۔ ثریا نے کہا:

"چلو ناشتہ نہیں کرو گی؟"

"چلیے!"

دونوں ساتھ ساتھ ناشتہ کے کمرہ میں پہنچیں۔ زبیدہ اطمینان سے کیک پر کیک اور توس پر توس کھا رہی تھی۔ ثریا نے کہا:

"ڈٹی ہوئی ہو؟"

زبیدہ نے کہا:

"آؤ!"

ثریا، حمیدہ اور زبیدہ ساتھ ساتھ ناشتہ کرنے لگیں۔ حمیدہ نے چائے کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگائی، اور ثریا کو کوئی چیز چمکتی ہوئی اس کی انگلی

میں نظر آئی۔ ثریّا نے غور سے دیکھا۔ تو یہ وہی انگوٹھی تھی، جو اس نے کبھی اقبال کو تحفہ میں دی تھی۔ ثریّا بظاہر چائے پی رہی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ خونِ جگر پی رہی تھی۔ اب تک وہ حمیدہ سے بدگمان تھی۔ اب اقبال کے متعلّق بھی اس کے دل میں کھٹکا سا پیدا ہوئی۔ لیکن وہ بڑی باضابطہ لڑکی تھی۔ کیا مجال جو اس نے اپنی کیفیت ظاہر ہونے دی ہو۔ زبیدہ ایک چالاک اور ذہین لڑکی تھی۔ اس نے جو دیکھا، ثریّا حمیدہ کی اُنگلی پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ خود بھی دیکھنے لگی۔ اور فوراً بھانپ گئی۔ معاملہ کیا ہے۔ اس نے فوراً حمیدہ سے کہا:

"بڑی اچھی انگوٹھی ہے؟"

حمیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ زبیدہ نے کہا:

"نگینہ کی جوت تو دیکھو، نظر نہیں ٹھہرتی ———— دیکھیں حمیدہ ذرا اُتارنا تو!"

ثریّا بالکل بے تعلّقی سے چائے پی رہی تھی۔ بظاہر وہ زبیدہ کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ لیکن دزدیدہ نظروں سے وہ حمیدہ کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اس چہرے میں معصومیّت اور سادگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ حمیدہ نے خاموشی سے انگوٹھی اتاری اور زبیدہ کے سامنے رکھ دی۔ زبیدہ اسے اُلٹ پُلٹ کر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کہا:

"بڑی اچھّی، بہت اچھی ———— دیکھو تو ثریّا!"

اس نے انگوٹھی ثریّا کی طرف بڑھا دی۔ ثریّا نے بے پروائی سے اسے

ذرا کے ذرا اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ پھر حمیدہ کو واپس کر دی۔ حمیدہ نے پھر اُسے اُنگلی میں پہن لیا۔ زبیدہ سے پھر نہ رہا گیا۔ اس نے کہا:

"کیوں حمیدہ، یہ کتنے میں لی؟"

حمیدہ نے مسکراتے ہوئے، اور قدرے شرماتے ہوئے کہا:

"مَیں نے مول نہیں لی!"

"پھر کہیں پڑی ہوئی مل گئی؟"

"جی یہ بات بھی نہیں ہے!"

"پھر؟"

"یہ نشانی ہے کسی کی!"

زبیدہ اُچھل پڑی:

"نشانی؟ کس کی؟"

حمیدہ لاجونتی کی طرح شرما گئی:

"ہم جانتے ہیں!"

اور وہ اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد زبیدہ نے ثریّا سے کہا:

"دیکھا تم نے؟"

ثریّا کسی خیال میں غرق تھی۔ وہ چونک پڑی۔ اس نے کہا:

"کیا ہُوا زبیدہ؟"

"ارے پگلی میں کہہ رہی ہوں دیکھا تُو نے؟"

"کیا؟"

"انگوٹھی، اور کیا میرا سر؟"

ثریا مسکرا دی:

"ہاں دیکھا، دیکھ لیا!"

زبیدہ نے کہا:

"میں جانتی ہوں، یہ انگوٹھی کس کی ہے؟ مجھے معلوم ہے یہ کس کے پاس تھی؟ میں دیکھ رہی ہوں، اب یہ کس کے قبضہ میں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گی!"

"کیا نہیں ہو سکتا؟ کیا نہیں ہونے دو گی؟"

"یہی تماشہ!"

ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا:

"اری باؤلی، دنیا تماشہ کے سوا ہے کیا؟ —— زیادہ نہ سوچا کرد ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا۔ آؤ چلیں!"

ثریا زبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئی۔ صبح کا اخبار رکھا ہوا تھا ثریا اسے دیکھنے لگی۔ اور زبیدہ موقع پا کر تیر کی طرح سیدھی حمیدہ کے کمرے میں پہنچی۔

حمیدہ آج بہت خوش تھی۔ وہ اپنی چارپائی پر لیٹی ہوئی دھیمے سروں میں کوئی سینما کا گیت گا رہی تھی۔ اتنے میں زبیدہ پہنچی۔ اسے دیکھ کر حمیدہ خاموش ہو گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا:

"کون ؟ زبیدہ بہن ؟ آؤ !"

زبیدہ خاموشی سے آکر بیٹھ گئی۔ آج حمیدہ کا موڈ بدلا ہُوا تھا، وہ خوش تھی، بہت خوش۔ اس نے زبیدہ کو چھیڑتے ہوئے کہا :

"کدھر بھول پڑیں ؟"

پھر وہ خود بخود مسکرائی۔ اور کہنے لگی :

"کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں !"

زبیدہ نے کہا :

"حمیدہ !"

وہ بولی :

"فرمایئے !"

بڑی سنجیدگی سے زبیدہ نے کہا :

"جو خواب تم دیکھ رہی ہو۔ وہ کسی دوسرے کے حسین خوابوں کو برباد کر دیں گے ؟"

حمیدہ نے حیرت کے ساتھ کہا :

"کیا کہہ رہی ہو بہن ؟"

زبیدہ نے بپھرتے ہوئے لہجہ میں کہا :

"میں کہہ رہی ہوں۔ جو زلزلہ اس گھر میں آیا ہے۔ اس کا اثر تمھاری اس مختصر سی چار دیواری پر بھی پڑا کچھ یا نہیں ؟"

حمیدہ نے اور زیادہ حیرت کے ساتھ پوچھا :

"زلزلہ ؟"

زمیدہ نے غصہ کے عالم میں کہا :

"بھولی نہ بنو، تم نے بھونچال بن کر اس گھر کے در و دیوار ہلا دیے ہیں؟"

حمیدہ سہم گئی۔ اس نے رو ہانسی ہو کر پوچھا :

"مَیں نے ؟"

"ہاں تم نے —————— تم نے ہرے بھرے باغ میں آگ لگا دی ہے !"

حمیدہ سے اور کچھ نہ بن پڑا۔ اس نے پھر اپنا سوال دُہرا دیا :

"مَیں نے ؟"

"ہاں تم نے ! —————— تم وہ ناگن ہو جو خود اپنے پالنے والے کو ڈس لیتی ہے !"

حمیدہ نے بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس کو جمع کیا۔ اور کہا :

"میں ناگن ہوں ؟"

"ہاں تم —— یہ انگوٹھی اُتار دو !"

حمیدہ نے تیکھے پن سے پوچھا :

"کیوں اُتار دوں ؟"

"یہ تمھیں اُتارنی ہی پڑے گی !"

"لیکن کیوں ؟"

"شریف لوگ ڈاکہ نہیں ڈالا کرتے۔ یہ انگوٹھی تمھاری نہیں ہے !"

حمیدہ نے پوچھا:

"پھر کس کی ہے؟"

زبیدہ نے سخت لب ولہجہ میں جواب دیا:

"ثریّا کی!"

"ثریّا کی؟"

"ہاں ثریّا کی —— لاؤ، اتار دو مجھے دو!"

حمیدہ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس نے بے کلی کے ساتھ پوچھا:

"یہ ثریّا کی ہے؟"

"ہاں —— اقبال ثریّا سے محبّت کرتا ہے۔ ثریّا اقبال کو چاہتی ہے —— پھر سُن لو، ثریّا اقبال کو چاہتی ہے۔ اپنا فرض پہچانو، اور یاد رکھو۔ آڑے تمہیں آنا ہوگا۔ ورنہ توڑ دی جاؤ گی۔ دیوار تمہیں بننا ہوگا۔ ورنہ ڈھا دی جاؤ گی۔ جسے بنانا آتا ہے وہ بگاڑ بھی سکتا ہے۔ جو پناہ دے سکتا ہے وہ نکال بھی سکتا ہے۔ جو رحم کر سکتا ہے، اُسے غصّہ بھی آ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی —— تم انگوٹھی اُتارتی کیوں نہیں؟"

حمیدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے خاموشی کے ساتھ انگوٹھی زبیدہ کو دے دی!

اور زبیدہ انگوٹھی لے کر واپس چلی گئی۔ اور اس کے جانے کے بعد

حمیدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ چند منٹ پہلے وہ کیا تھی؟ اور اب کیا بن گئی؟ اس مختصر سی مدت میں اُمیدوں کا محل بنا، اور منہدم بھی ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ زبیدہ کیا کہہ گئی۔ اقبال ثریّا کو چاہتا ہے، اور ثریّا اقبال کو۔ گویا اب تک میرے ساتھ مذاق ہو رہا تھا؟ میری غربت کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا؟ جو کچھ ہوُا ٹھیک ہوُا۔ میں اسی قابل تھی۔ غریب ہوں نا؟ غربت کا اسی طرح مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ اسے اسی طرح چھیڑا جاتا ہے۔ اور ادھر ثریّا اپنے کمرہ میں افسردہ اور مضمحل چُپ چاپ بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اخبار پر جمی ہوئی تھیں۔ اور دل نہ جانے کہاں تھا؟ دماغ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اور وہ شریر زبیدہ، ان دونوں سے بے خبر اور بے پروا اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ سیدھی اقبال کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ اس وقت کہیں باہر جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹکا:

"آپ؟"

"جی یہ خاکسار، اگر حکم ہو تو واپس جاؤں؟"

"جی نہیں تشریف رکھیے!"

زبیدہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سامنے دوسری کُرسی پڑی تھی۔ اس پر اقبال بیٹھ گیا۔ زبیدہ نے کہا:

"آپ شاعر ہیں؟"

اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا:

"الحمدللہ کہ نہیں ؟"

وہ بولی :

"اور فلسفی ؟"

اقبال نے جواب دیا :

"یہ جرم بھی اب تک سرزد نہیں ہوا !"

کہنے لگی :

"پھر آپ اتنے بدحواس کیوں ہیں ؟"

"پہیلی نہ بجھائیے ۔ صاف صاف کہیے !"

زبیدہ نے اقبال کی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

"انگوٹھی کیا ہوئی ؟"

اقبال اس سوال جواب کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا ۔ وہ چکرا گیا :

"انگوٹھی ؟"

"اب بنیئے نہیں ، صاف صاف بتائیے ، کہاں ہے وہ ؟"

اقبال سر کھجانے لگا :

"وہ تو

"گم ہو گئی —— آپ سے اور امید ہی کیا تھی ؟ آپ کو معلوم ہے ، تحفوں کی ناقدری کرنا کتنا بڑا اخلاقی جرم ہے ؟ —— یہ لیجیے ؟"

یہ کہہ کر زبیدہ نے انگوٹھی اقبال کی طرف بڑھا دی ۔ اقبال ہنسنے لگا ۔

"بڑی شریر ہو زبیدہ تم!"

"شکریہ، اس عزّت افزائی کا —— اب آپ چپ چاپ اسے پہن لیجیے!"

اقبال نے انگوٹھی پہن لی، اور کہا:

"کوئی اور حکم؟"

"ہاں!"

"وہ بھی فرما دیجیے!"

"ایسی غلطی اب کبھی نہ ہو!"

"اس حکم کی تعمیل سر آنکھوں پہ کی جائے گی۔ اب اجازت ہے مجھے جانے کی؟"

"تشریف لے جائیے!"

اقبال ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا، باہر چلا گیا۔

زبیدہ شاداں و فرحاں، ثرّیا کے کمرہ میں پہنچی۔ ثرّیا نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر اخبار پڑھنے لگی۔ زبیدہ نے اخبار اس کے ہاتھ سے چھین لیا، اور پیٹھ اس کی طرف کر کے بولی:

"پیٹھ ٹھوکو ہماری!"

ثرّیا مسکرا دی:

"یہ کیوں؟ کون سا گڑھ جیت کے آئی ہو؟"

"سناؤں ساری رام کہانی؟"

زبیدہ پاس آ کر بیٹھ گئی کہ سارا ماجرا سُنا دے۔ ثریّا نے کہا:

"کوئی نئی شرارت کر کے آئی ہو گی، مَیں نہیں سُنتی!"

زبیدہ نے کہا:

"تو مَیں خفا ہو جاؤں گی!"

ثریّا مسکرائی:

"خفا ہونے سے پہلے تھوڑا سا زہر لا کے مجھے دے دو!"

زبیدہ اس سے لپٹ گئی:

"زہر کھائیں تیرے دشمن!"

ثریّا نے کہا:

"جاؤ تمھیں امّی نے بلایا ہے۔ وہ آئی ہیں بلقیس چچی!"

بلقیس چچی کا نام سُن کر زبیدہ شرما گئی۔ بلقیس چچی کے لڑکے سے زبیدہ کی منگنی ہو چکی تھی۔ اور اب شادی ہونے والی تھی۔!

باب ۲۱

انکشاف

نواب صاحب کے محل میں اس وقت غلط فہمیوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ پہلے صرف حمیدہ اور اقبال میں غلط فہمی تھی۔ لیکن بہت معمولی سی اب ثریا اور اقبال میں غلط فہمی تھی۔ حمیدہ اور اقبال کے دل پھر ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور اقبال اس طوفان سے قطعاً ناواقف تھا۔ جو ثریا کے دل میں اُمنڈ رہا تھا۔ جس نے حمیدہ کے دل کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ اقبال نے زبیدہ کے کہنے سے انگوٹھی پہن لی۔ وہ جانتا تھا۔ زبیدہ کا کام ہی شرارت ہے۔ اس نے کچھ اِدھر اُدھر کی جھڑکے حمیدہ سے انگوٹھی لے لی ہوگی یا سوتے میں اس کی اُنگلی سے اُتار لی ہوگی۔ میں حمیدہ سے ملوں گا۔ اس کی انگوٹھی اسے واپس کر دوں گا۔ اس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ انگشتری کا معاملہ اتنی سنجیدگی اختیار کر لے گا کہ حمیدہ اور ثریا دونوں ہی اس سے بدگمان ہو جائیں گی۔ دونوں کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ اور دونوں اس سے دُور بھاگنے لگیں گی۔ اور وہ زبیدہ جس نے یہ آگ لگائی تھی۔ بالکل بے فکری سے انجان بنی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم

رہی تھی۔ حالانکہ وہ یہ جانتی تھی کہ اس نے جو آگ لگائی ہے وہ یونہی نہیں بجھ سکتی۔ وہ ضرور بھڑکے گی۔ ضرور کسی نہ کسی دل کو وہ خاکستر کر کے رہے گی۔ وہ جانتی تھی۔ دل اگر جلے گا، تو حمیدہ کا۔ دل اگر خاکستر ہوگا تو حمیدہ کا۔ ثریا کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا مخالفانہ اثر اس پر بھی پڑ سکتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ سارا معاملہ چند لمحوں میں طے کر چکی تھی۔ حمیدہ سے اس نے انگوٹھی چھین لی تھی۔ اسے دھونس بھی دے دی تھی۔ وہ انگوٹھی پھر اُس اُنگلی میں اُس نے پہنا دی تھی۔ جس سے وہ اُتر کر حمیدہ کی اُنگلی میں پہنچی تھی۔ رہی ثریا، تو اب اس سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس کی آنکھیں نہیں ہیں؟ اس نے ضرور اپنا قیمتی تحفہ اقبال کی اُنگلی میں دیکھ لیا ہوگا، اور مطمئن ہو گئی ہوگی۔

اس واقعہ کو کئی دن گزر گئے۔ حمیدہ اور اقبال میں ملاقات نہ ہو سکی۔ ملاقات نہ ہونے کی وجہ یہ تھی۔ کہ ان دونوں میں آزادانہ ملاقات اور گفتگو کا اس گھر میں کوئی امکان نہیں تھا۔ نواب صاحب، بیگم صاحبہ، ثریا اور زبیدہ کوئی بھی اصل واقعہ سے واقف نہیں تھا۔ لہذا جب تک بات صاف نہ ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے سے محتاط رہنے پر مجبور تھے۔ اقبال بالاخانے سے نیچے آ رہا تھا۔ اور حمیدہ نیچے سے بالاخانہ جا رہی تھی۔ اتفاق سے اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ اس موقعہ سے اقبال نے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ کہ حمیدہ کو انگوٹھی واپس کر دے۔ لیکن حمیدہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اقبال کو دیکھ کر اس کے دلِ ناتواں

میں شورش پیدا ہو گئی۔ اقبال نے محبّت بھری نظروں سے حمیدہ کی طرف دیکھا اور کہا:

"حمیدہ!"

حمیدہ رُکے بغیر اوپر چلی گئی۔ اقبال مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دونوں میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ اقبال اوپر واپس جا رہا تھا اور حمیدہ کسی کام سے بیگم صاحبہ کے پاس نیچے جا رہی تھی۔ اقبال نے پھر اسے روکا:

"حمیدہ!"

وہ بے رُخی سے بولی:

"ہٹ جائیے، نواب صاحب آ رہے ہیں!"

اقبال پیچھے مڑ کر نواب صاحب کو دیکھنے لگا۔ اور حمیدہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اقبال سمجھ گیا۔ حمیدہ کیوں خفا ہے؟ مگر حمیدہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اقبال اس پر طنز کر رہا ہے۔ اس کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ اس سے کھیل رہا ہے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہُوئے اپنے کمرہ میں پہنچی۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور تکیہ میں مُنہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے سے دل کا بوجھ اُتر جاتا ہے۔ حمیدہ اسی طرح اپنے ٹوٹے ہُوئے اور بے بس دل کا بوجھ اُتارنے کی کوشش کر رہی تھی —

— ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

عصر کے وقت تک حمیدہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ پھر وہ منہ ہاتھ دھوکر

باہر آئی۔ اب اسے ثریّا سے ملتے ہُوئے، آنکھیں چار کرتے، باتیں کرتے شرم آتی تھی۔ کس دل سے ملے؟ کس زبان سے بات کرے۔ رہی زبیدہ تو اس سے وہ پہلے بھی کچھ زیادہ مانوس نہ تھی۔ اور جس دن سے وہ اس کی پونجی پر ڈاکہ ڈال کے گئی تھی۔ وہ زبیدہ کو دیکھ کر کترا جاتی تھی۔ اس کا جی اس وقت بہت گھبرا رہا تھا۔ اس نے سوچا چلو پائیں باغ کی سیر کر لیں۔ شاید وہاں کی فضا سے طبیعت درست ہو جائے۔ خیال کچھ بٹ جائے۔

پائیں باغ کے ایک سبزہ زار پر، ایک گارڈن ٹیبل اور چند کرسیاں رکھی ہیں۔ ثریّا اور اقبال بیٹھے ہیں۔ زبیدہ پاس کھڑی ہے۔ ثریّا کچھ چُپ چُپ ہے۔ اقبال بھی ثریّا کی خاموشی کے سبب چُپ سادھے ہوئے ہے۔ زبیدہ چاہتی ہے، یہ دونوں کُھل مل کے باتیں کریں۔ وہ شوشہ چھوڑتی ہے۔ اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اقبال سے سوال کیا:

"ایک بات تو بتائیے!"

اقبال نے بڑے تپاک سے کہا:

"فرمائیے!"

زبیدہ نے پوچھا:

"یہ دل دھک دھک سا کیوں کرتا ہے؟"

اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا:

"دھک دھک کرنا، یہی تو دل کا کام ہے!"

زبیدہ نے بڑے بھولے پن سے پوچھا:

"اور دھڑکن، یہ کیا چیز ہے؟"

اقبال نے کہا:

"دھڑکن دھڑکن ہے اور کیا ہے؟"

ثریّا مسکرا دی۔ زبیدہ نے کہا:

"اچھا ایک بات اور بتائیے!"

اقبال نے خندہ پیشانی سے کہا:

"وہ بھی پوچھ لیجیے!"

زبیدہ بولی:

"محبّت کی تعریف؟"

اقبال نے جواب دیا:

"محبّت اتنی نازک چیز ہے کہ وہ الفاظ کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔ اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ سمجھایا نہیں جا سکتا ہے!"

زبیدہ نے مُنہ بنا کر کہا:

"ہماری سمجھ میں نہیں آتیں یہ باتیں!"

اقبال نے کہا:

اسی لیے تو میں نے آپ کو نہیں سمجھایا۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو آپ کی سمجھ ہی میں نہیں آ سکتا!"

"کیوں بھلا؟"

"بجائے اس کے کہ میں اپنی زبان سے کچھ کہوں، داغ کا ایک شعر سُنا دے

دیتا ہوں۔ عرض کیا ہے ؎

سوز یہ کینہ ساز کیا جانیں؟
ناز والے نیاز کیا جانیں؟

آپ ناز اُٹھوائیے۔ نیاز مندی کے لیے بلقیس چچی کے صاحبزادے کافی ہیں۔ کیوں ثریّا کیا نام ہے اُن کا؟"

ثریّا پھول کی طرح کھِل گئی۔ اس نے کہا:

"اب جواب دو زبیدہ! بہت بڑھ بڑھ کے بول رہی تھیں۔ یہ اوس کیوں پڑ گئی؟"

ان لوگوں میں گھل مل کے یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حمیدہ ادھر سے گزُری۔ زبیدہ نے تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اقبال نے دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ ثریّا نے اخلاق اور خلوص کے ساتھ کہا:

"آؤ حمیدہ چائے پیو!"

حمیدہ کا چائے پینے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اور زبیدہ اقبال کو یہاں میٹھا دیکھ کر تو اس کا جی چاہنے لگا کہ بھاگ جائے۔ لیکن ثریّا کا کہا وہ نہیں ٹال سکتی تھی۔ چُپ چاپ آ کر میٹھ گئی۔ ثریّا نے ٹرے اس کی طرف کھسکا دی:

"تمہی بناؤ!"

وہ خاموشی سے سر جھکائے چائے بنانے لگی۔ زبیدہ نے کہا:

"برائے عنایت میرے لیے زحمت نہ کیجیے گا۔ میں اپنی چائے خود بنا لوں گی، اپنے ہاتھ سے!"

ثریّا کو زبیدہ کی اس حرکت پر غصّہ آگیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے حمیدہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا:

"چلو حمیدہ، ایسے بدتمیزوں کے ساتھ چائے پینا تو بڑی چیز ہے بیٹھنا بھی گناہ ہے —— زبیدہ تمھاری یہ باتیں مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کئی دن سے تم حمیدہ کی توہین کر رہی ہو۔ میں اپنی توہین برداشت کر سکتی ہوں اس کی نہیں!"

زبیدہ نے خفیف ہو کر، حمیدہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر بٹھا لیا۔ ثریّا سے کہا:

"ہم جانیں۔ اور حمیدہ جانیں۔ تم بیچ میں بولنے والی کون۔ اے واہ، قاضی جی کیوں دُبلے، شہر کے اندیشے میں!"

اقبال نے ثریّا سے کہا:

"معاف کر دیجیے، زبیدہ کی بات کا بُرا ماننا کیا؟"

ثریّا بیٹھ گئی۔ زبیدہ نے اقبال سے کہا:

"واقعی آپ بڑے اقبال مند ہیں۔ ثریّا جیسی ضدّی چھوکری سے اُٹھا بیٹھی کرانا کچھ آسان ہے!"

پھر زبیدہ نے ٹرے اپنے سامنے بڑھا لی اور بولی:

"ہم پلائیں گے حمیدہ کو اپنے ہاتھ سے چائے!"

وہ چائے بنانے لگی:

سب نے اطمینان سے چائے پی۔ بڑی دیر تک یہ مجلس جمی رہی۔ ایک

حمیدہ تھی جو گُم صُم بیٹھی تھی۔ ورنہ محفل میں جتنے تھے، سب بُلبُل کی طرح چہک رہے تھے۔ اور شریر زبیدہ تو خود بھی ہنس رہی تھی اور دوسروں کو بھی ہنسا رہی تھی۔ اس کا کام ہی یہی تھا۔

روز حمیدہ عشا کی نماز پڑھتے ہی سو جاتی تھی۔ لیکن آج نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ آج اس کا اور اقبال کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ آج وہ اقبال کے پاس بڑی دیر تک بیٹھی تھی۔ لیکن اجنبی کی طرح۔ آج ثریا نے زبیدہ کو اس کے لیے ڈانٹا تھا۔ آج بھی اس نے اقبال کی اُنگلی میں وہ چمکتی ہوئی انگوٹھی دیکھی۔ یہ سب باتیں رہ رہ کر اسے یاد آ رہی تھیں۔ اس کا دل بے چین تھا۔ وہ خود بے کل تھی۔ رات کے بارہ بج گئے۔ مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ کبھی وہ ٹہلنے لگتی، کبھی بیٹھ جاتی۔ کبھی کھڑکی میں کھڑی ہو کر وہ پائیں باغ کا نظارہ کرنے لگتی۔ وہ جگہ یہاں سے چاند کی جگمگ کرتی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ جہاں آج مجلس جمی تھی۔ جہاں زبیدہ نے اس کی توہین کی تھی۔ جہاں ثریا نے اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی کوشش کی تھی، جہاں اقبال نے اس کے دل کو پھر توڑ دیا تھا۔

بڑی دیر تک وہ خاموشی کے ساتھ کھڑکی میں کھڑی پائیں باغ کا نظارہ کرتی رہی۔ پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ وہ گنگنانے لگی۔ اور پھر وہ میٹھے میٹھے سروں میں گانے لگی ؎

چُھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
نہ پھُول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا

رات کا وقت فضا کی خاموشی، پرسوز نغمہ، ان سب چیزوں نے مل کر ایک عجیب کیف سا طاری کر دیا تھا۔ اور عین اس وقت جب حمیدہ کا درد میں ڈوبا ہوا نغمہ فضا میں گونج رہا تھا۔ اقبال اپنے کمرہ سے نکلا۔ اور سیدھا ہمّت کر کے حمیدہ کے کمرہ میں آ گیا۔ آج اسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ آج پائیں باغ کی مجلس میں اس نے حمیدہ کا اُترا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس کے لرزتے ہوئے ہونٹ دیکھے۔ اور سب کچھ جان لیا تھا۔ اور اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ خود حمیدہ سے کم بے بس نہ تھا۔ سوا خاموش رہنے اور سر جھکائے رہنے کے اور چارۂ کار کیا تھا اس کے لیے؟ جس طرح حمیدہ کی آنکھوں سے نیند روٹھی ہوئی تھی۔ یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ وہ بھی بستر پر لیٹا ہُوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اور آخر جب حمیدہ کی آواز اس کے کانوں میں پہنچی تو وہ ضبط نہ کر سکا۔ ایک مجرم کی طرح اپنی محبوبہ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ اور جب وہ بیتابانہ اپنے کمرہ سے نکل کر حمیدہ کے کمرہ کی طرف بڑھا۔ تو ایک اور ہستی چوری چھپے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ ثریّا تھی۔ حمیدہ کی سراپا حسرت نغمہ گری نے اس کی نیند بھی اُڑا دی تھی۔ وہ بھی کروٹ بدلتے بدلتے جب تھک گئی، تو حمیدہ کے آنسو پونچھنے کے لیے باہر نکلی۔ اس کا خیال تھا حمیدہ کی آج زبیدہ نے توہین کی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر یہ نالۂ سوزاں اس کے مُنہ سے نکل رہا تھا۔ لیکن جب وہ کمرہ سے باہر نکلی تو اس نے اقبال کو اس کی طرف جاتا ہُوا دیکھا اور وہ ٹھٹک گئی۔ اور جب اقبال اندر پہنچ گیا۔ تو وہ آئی۔ اور دروازہ کی اوٹ سے کھڑی ہو کر ان دونوں کی باتیں سننے لگی۔

اقبال کو دیکھ کر حمیدہ نے گانا بند کر دیا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں ابتک پُرنم تھیں۔ اس نے کہا:

"آپ؟ اس وقت؟"

اقبال نے کہا:

"ہاں حمیدہ، میں! تم نے بُلایا اور میں آ گیا!"

حمیدہ نے حیرت سے کہا:

"میں نے بُلایا؟ کب؟"

اقبال نے کہا:

"ابھی، اور کب؟ —————— حمیدہ یہ تمھاری آنکھوں میں آنسو کیوں؟"

حمیدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"یہ آنکھیں اسی لیے بنی ہیں!"

اقبال بے قرار ہو کر بولا:

"یہ نہ کہو حمیدہ!"

حمیدہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"آپ جو چاہیں کریں؟ میں روؤں بھی نہیں؟ آنسو بھی نہ بہاؤں اپنے حالِ زار پر؟"

اقبال حمیدہ کے اور قریب آ گیا:

"حمیدہ دفن کر دو ان آنسوؤں کو، گلا گھونٹ دو اس فریاد کا"

حمیدہ بولی:

"لیکن آنسوؤں پر بس کس کا ہے؟ یہ وہ مینہ ہے جو بغیر بادل کے برستا ہے۔ اس میں نہ گرج ہے نہ چمک۔ لیکن یہ برسنے پر آتا ہے تو برستا رہتا ہے۔ پھر روکے نہیں رُکتا؟"

اقبال:

"لیکن کیوں؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہُوا؟ کسی نے کچھ کہا؟"

حمیدہ:

"آپ کی عنایت کا شکریہ، کسی نے نہ کچھ کہا، نہ کیا۔ میں پاگل ہوں یونہی رونا آگیا۔ آپ ہنسی پر قابو نہیں رکھتے۔ میرا رونے پر بس نہیں!"

اقبال:

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو حمیدہ؟ تمھارا ایک ایک لفظ میرے دل پر تیر کی طرح لگ رہا ہے۔ رحم کرو، مجھ پر بھی اور اپنے اوپر بھی!"

حمیدہ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا:

"رحم! —— آپ اس لفظ کے معنی جانتے ہیں؟"

اقبال نے روہانسی آواز میں کہا:

"نہیں —— تم تو جانتی ہو، تم ہی سکھا دو!"

حمیدہ روٹھ کر بولی:

"آپ اپنی نیند خراب کر کے یہاں کیوں آگئے؟ کسی نے دیکھ لیا تو؟"

اقبال نے جواب دیا:

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا کرے گا!"

"آپ بدنام ہو جائیں گے!"

"عشقِ صادق بدنامی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ رسوائی کا خیر مقدم کرتا ہے!"

"شکریہ، بہت بہت شکریہ!"

"حمیدہ یہ باتیں چھوڑو، کام کی باتیں کرو!"

"کام کی بات صرف یہ ہے کہ میرا خیال چھوڑ دیجیے۔"

"کیوں! کیوں چھوڑ دوں؟"

"آپ موتی چھوڑ کر کنکر کی طرف لپک رہے ہیں۔ یہ غلطی ہے!"

اقبال نے حیرت سے کہا:

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو!"

حمیدہ نے کہا:

"اس محبت کے راستے میں فولادی دیواریں حائل ہیں۔"

"فولادی دیواریں؟"

"ہاں —— مثلاً غربت اور امارت۔ میں غریب ہوں، آپ امیر ہیں!"

"بالکل غلط، تم نے مجھے امیر کیسے سمجھ لیا۔ میری اور تمھاری پوزیشن بالکل ایک ہے۔ نواب صاحب نے جس طرح تمھاری یتیمی پر رحم کھا کر تمھیں پالا اسی طرح میں بھی یتیم تھا۔ اور وہ مجھے یہاں لے آئے۔ میں نے اُن کے دامن میں

پناہ پائی۔ پڑھا، بڑھا، جوان ہوا۔ لیکن ایاز قدر خود بشناس۔ میں ایاز ہوں۔ اور اپنی حقیقت کو پہچانتا ہوں۔ نواب صاحب بے شک مجھے اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ اولاد کی طرح رکھتے ہیں۔ لیکن میں ان کی اولاد نہیں ہوں۔ ثریا ان کی چہیتی اور اکلوتی لڑکی ہے۔ وہی سب کچھ ہے۔"

حمیدہ نے کہا:

"آپ نے ٹھیک کہا۔ لیکن سوچیے تو۔ میں ثریا بہن کے حق پر کس طرح ڈاکہ ڈال سکتی ہوں۔ ان سے بڑھ کر شریف لڑکی اس پردۂ دنیا پر میں نے نہیں دیکھی۔ یہ آپ کی محسن بھی ہیں، اور میری بھی۔ آپ کی احسان شناسی کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ اُن کا دل نہ توڑیں۔ اور میری احسان شناسی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں مر جاؤں۔ لیکن اپنے دل میں وہ خیال بھی نہ آنے دوں جو اُن کے دل میں پرورش پا رہا ہے!"

اقبال نے حیرت سے حمیدہ طرف دیکھا اور کہا:

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں اور ثریا —— یعنی ثریا اور میں؟ —— یعنی ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں میرا یہی مطلب ہے —— زبیدہ بہن مجھے سب کچھ بتا چکی ہیں۔ ایک ایک بات انگوٹھی چھینتے وقت اُنھوں نے کہہ دی تھی؟"

اقبال ہنس پڑا:

"بس یہی ہیں تمہاری فولادی دیواریں؟"

"جی، کہہ دیجیے، غلط ہیں!"

"ارے بھئی بالکل غلط ——— تم زبیدہ کو اب تک نہیں سمجھیں۔ میں نے اس کا نام بی جمالو رکھا ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ فتنے جگائے اور ہنگامے برپا کرے۔ وہ کوئی بات سنجیدگی سے نہیں کہتی ——— دلچسپی کے لیے وہ بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتی ہے۔ اور خطرناک سے خطرناک بات کہہ سکتی ہے۔ زبیدہ کی کھڑی کی ہوئی دیواریں، فولاد کی نہیں، ریت کی ہوتی ہیں۔ انھیں گرانے کی ضرورت نہیں، وہ خود بخود گر جاتی ہیں!"

حمیدہ نے پوچھا:

"تو سب کچھ جھوٹ تھا؟ وہ جھوٹ بول رہی تھیں؟"

اقبال نے جواب دیا:

"ہاں اور کیا ——— تم اتنی بے وقوف ہو کہ تم نے یقین کر لیا؟ ارے خدا کی بندی یہ تو سوچا ہوتا۔ میرا اور ثریا کا جوڑ کیا؟ میں زمین پر رہنے والا، وہ آسمان پر اُڑنے والی۔ میں غریب ابن غریب، وہ نواب زادی۔ مصیبت میرا مقسوم، عشرت اس کا حصّہ، میں چاکر، وہ میری آقا زادی۔ میں اس سے عشق کر سکتا ہوں؟ وہ مجھ سے محبّت کر سکتی ہے؟ میں اُسے خوش رکھ سکتا ہوں؟ وہ مجھ سے خوش رہ سکتی ہے؟ کیا ہر وقت اپنی نواب زادی بیوی کو دیکھ کر میرے اندر احساسِ کمتری نہیں پیدا ہوگا؟ کیا ہر وقت اپنے لے پالک شوہر کو دیکھ کر اسے خود اپنے سے شرم نہیں آئے گی؟ کیا وہ یہ سوچ سوچ کر مجھ سے نفرت نہیں کرنے لگے گی کہ اس کے ٹکڑوں پر پلا ہوا شخص اس کا شوہر ہے؟ کیا اس کی امیر زادی سہیلیاں اس کا مذاق اُڑا اُڑا کر، اُس کی زندگی اجیرن نہیں کر دیں گی؟

پھر مجھ میں کون سے لعل جڑے ہیں! میں حسن میں یوسفِ ثانی نہیں۔ دولت میں اس کا ہمسر نہیں۔ علامۂ دہر اور فاضلِ اجل نہیں۔ مجھ سے کہیں بہتر اور برتر لوگ اسے مل سکتے ہیں، اور ملیں گے۔ لیکن اقبال کو کوئی اور حمیدہ نہیں مل سکتی۔ حمیدہ کو کوئی اور اقبال نہیں مل سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جس طرح نباہ سکتے ہیں۔ اقبال اور ثریا نہیں! ہرگز نہیں! —— میں ثریا سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی عزت کرتا ہوں۔ محبت تو صرف ہم تم کر سکتے ہیں۔ میری طرف دیکھو، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو۔ ان میں آج بھی وہی محبت کے پیمانے چھلک رہے ہیں، جنھیں اس سے پہلے تم بارہا دیکھ چکی ہو!"

اقبال حمیدہ کے اور قریب آ گیا۔ اس نے حمیدہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے اور کہا:

"بتاؤ، بولو، اب کیا کہتی ہو!"

حمیدہ مسکرائی، اور شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ اب اس کا دل بالکل صاف ہو چکا تھا۔ غلط فہمی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ اور اُمید و آرزو کا چاند پھر چمکنے لگا تھا۔ حمیدہ نے پوچھا:

"پھر یہ انگوٹھی کا راز کیا ہے؟"

اقبال نے جواب دیا:

"کچھ بھی نہیں —— میری کامیابی پر مجھے نواب صاحب، بیگم صاحبہ وغیرہ نے بہت سے تحفے دیئے تھے۔ یہ تحفہ ثریا نے دیا تھا۔ تحفہ دیتے

وقت نہ اس کے دل میں عشق انگڑائیاں لے رہا تھا اور اسے قبول کرتے وقت میرا دل بھی کیوپڈ کی زد سے بالکل باہر تھا —— ارے بھئی یہ جھک جھک کرتے کرتے میرے سر میں درد ہونے لگا۔ سمجھ میں آیا کچھ؟"

حمیدہ نے سب کچھ سمجھتے ہوئے کہا:

"لیکن زبیدہ بہن تو ——

اقبال نے بات کاٹ لی:

"پھر وہی زبیدہ بہن —— خدا کے لیے اس کا نام نہ لیا کرو۔ آج تم اپنی آنکھ سے دیکھ چکی ہو سارا تماشہ۔ تمھارے ساتھ جب اس نے چھیڑ چھاڑ کی تو ثریا نے کیسا جھاڑا ہے اسے؟ اس کی زندگی کا تو مقصد ہی یہی ہے!"

ثریا، دروازہ کے باہر دیوار سے لگی ہوئی، اقبال اور حمیدہ کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اس ساری گفتگو کا ایک ایک لفظ بڑے غور اور توجہ سے سنا تھا۔ حمیدہ اس کی نظر میں سراپا عفت و عصمت تھی۔ بے قصور اور بے خطا —— اور اقبال؟ —— اقبال کی بھی اسے کوئی خطا نہیں نظر آرہی تھی۔ اس نے حمیدہ اور اقبال کو دل ہی دل میں معاف کیا۔ دونوں کو ایک دوسرے کا مالک تسلیم کر لیا۔ اور چپ چاپ دبے پاؤں کمرے میں آکر اپنے بستر پہ لیٹ گئی۔ اس کے چہرے پہ یاس کا اثر ضرور تھا لیکن محرومی کا نہیں!

حمیدہ نے کہا:

" مجھے ڈر ہے۔ میری زندگی کی ناؤ، منجدھار میں نہ ڈوب جائے۔"

اقبال نے کہا :

" یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب دل ایک، ارادے نیک ہوں، تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی!"

باب ۲۲

غمِ ناگہاں

ثریّا نے حمیدہ اور اقبال کی باتیں سُن لیں۔ اور اُن باتوں کو وہ بھلا نہ سکی۔ وہ ایک عجیب و غریب لڑکی تھی۔ اس میں پہاڑ سا وقار تھا۔ سمندر کی گہرائی تھی۔ اور ان پر جان کو قربان کر دینے والی عندّ تھی۔ بچپن سے اس کی یہ عادت تھی کہ وہ رعب کھاتی کم تھی، ڈالتی زیادہ تھی۔ دل کا راز وہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ اقبال کو جان و دل سے چاہتی تھی۔ لیکن اس طرح کہ اگر اس کا بس چلتا، تو اس راز کو وہ خود اپنے اوپر بھی افشا نہ ہونے دیتی۔ یہ معلوم کر کے کہ اقبال اسے نہیں چاہتا۔ اس کی جان پر بنی جا رہی تھی۔ لیکن کیا مجال ہے کہ اس نے اپنی رفتار و گفتار سے کسی کو یہ بھانپنے کا موقع دیا ہو کہ محبت کا تیر اس کے دل میں جاگزین ہو چکا ہے۔ وہ عیش و عشرت کے گہوارے میں جھولی اور لاڈ پیار کی گود میں پلی۔ لیکن اس کی افتادِ طبیعت میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس کا سبھاؤ اور برتاؤ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔ وہ امیر تھی۔ لیکن غریبوں سے محبت کرتی تھی۔ اقبال کیا تھا؟ ایک لاوارث لڑکا۔ لیکن ثریّا کے دل پر وہ راج کر رہا تھا۔ حمیدہ کیا تھی؟ ایک مظلوم اور تباہ حال

لڑکی۔ لیکن ثریّا کی نظر میں اس سے بڑھ کر محبوب کوئی نہ تھا۔ زبیدہ کیا تھی؟ اس کی رشتہ کی بہن، لیکن جس کا باپ بیٹی کا زیور تک ریس اور اس کے داؤ پر لگا کر ہار گیا تھا۔ لیکن ثریّا کی سب سے زیادہ مُنہ چڑھی اور بے تکلّف سہیلی وہی تھی۔ نوکروں اور ماماؤں کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ نہایت شفقت آمیز تھا۔ اس نے کبھی کسی کو ڈانٹا نہیں۔ کبھی کسی پر جرمانہ نہیں کیا۔ کبھی کسی کو برخاست نہیں کیا۔ وہ انعام مُنہ مانگا دے سکتی تھی۔ لیکن سزا دینا اس کے بس سے باہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر کا ہر چھوٹا بڑا اس پر جان چھڑکتا تھا۔ اس کے سر میں درد بھی ہوتا، تو سب بے قرار ہو جاتے۔ اس بیقراری میں نمائش نہیں تھی، جس کا مظاہرہ عام طور پر دولت مندوں کے سامنے کیا جاتا ہے۔ یہ خلوص اور سچائی پر مبنی تھی۔ اگر کسی طرح اس کی دولت و امارت اس سے چھین لی جاتی تو بھی اس کے لیے سب اسی طرح بے قرار اور مضطرب ہوتے، جس طرح اب نظر آتے تھے۔

ثریّا نے اقبال اور حمیدہ کی باتیں سُنیں اور چپ چاپ آ کر اپنے بستر پر لیٹ رہی۔ رات کو نہ جانے کب سوئی۔ نیند آئی بھی یا نہیں؟ صبح کو جب وہ اُٹھی۔ تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور بدن بھاری تھا۔ دن بھر وہ ٹالتی رہی۔ اپنی کیفیت اس نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔ شام ہوتے ہوتے اسے اچھا خاصہ بخار چڑھ آیا۔ سب سے پہلے

زبیدہ کو یہ حال معلوم ہُوا۔ اس سے بیگم صاحبہ کو، ان سے نواب صاحب کو، نواب صاحب سے اقبال کو، اقبال سے حمیدہ کو، سارے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ ثریّا کو بخار ہے۔ سب اس کے کمرے میں جمع ہوگئے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ ثریّا کی تیمارداری کے لیے اپنے آپ کو وقف کردے۔ اقبال کو یہ جمگھٹ پسند نہ آیا۔ اُس نے کہا :

"اس طرح تو ان کی طبیعت اور خراب ہوجائے گی؟"

بیگم صاحبہ بولیں :

"پھر کیا کیا جائے بیٹا؟"

نواب صاحب نے کہا :

"کسی اور ڈاکٹر کو بھی مشورہ کے لیے بُلا لو!"

اقبال نے کہا :

"تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، معمولی بخار ہے کل تک اُتر جائے گا۔ لیکن مریض کے پاس مجمع نہیں ہونا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں سب لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ زبیدہ اور حمیدہ دیکھ بھال اچھی طرح کر لیں گی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی خبر لیتا رہوں گا آ کر!"

نواب صاحب نے سب سے پہلے تعمیل حکم کی۔ وہ کمرے سے باہر چلے آئے۔ ان کے پیچھے بیگم صاحبہ اور ان کے پیچھے پیچھے سب لوگ صرف زبیدہ اور حمیدہ اندر رہ گئیں۔ اقبال بھی باہر آ گیا۔ آتے وقت اس نے

تاکید کردی کہ ہر دو گھنٹے بعد دوا دے دی جایا کرے۔

کئی دن گزر گئے، مگر ثریّا کا بخار نہ اُترا۔ کبھی تیز ہو جاتا، کبھی ہلکا ہو جاتا۔ اب کھانسی بھی آنے لگی۔ علاج اقبال ہی کا ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے وقت کا کافی حصّہ اس کے پاس صرف کرتا تھا۔

ایک دن حسبِ معمول اقبال ثریّا کے پاس کُرسی پہ بیٹھا ہُوا تھا۔ ثریّا خاموشی سے لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ زبیدہ کسی کام سے بیگم صاحبہ کے پاس گئی ہوئی تھی۔ اور حمیدہ دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اقبال نے پہلے ثریّا کی نبض دیکھی۔ پھر تھرمامیٹر سے بخار دیکھا، ۱۰۰ ڈگری تھا۔ وہ فکرمند سا ہوگیا۔ ثریّا نے کہا:

”بخار ہے؟“

”ہاں ——— یونہی تھوڑا سا!“

ثریّا مسکرا دی۔ اس نے کہا:

”یہی تو خطرناک ہوتا ہے!“

اقبال گھبرا گیا:

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ معمولی بات ہے چند دن میں آپ چنگی ہو جائیں گی

ثریّا نے کہا:

”آپ مجھے تسلّی دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ زندگی مجھے اتنی محبوب نہیں ہے کہ میں موت سے ڈرنے لگوں! ——— جانتی ہوں موت سے کس کو رستگاری ہے!“

اقبال نے کہا:

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے!"

ثریّا خاموش ہو گئی۔ وہ پھر چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگی۔

اقبال نے بےتابی کے ساتھ پھر اس کی نبض دیکھی۔ اور کہا:

"بخار تو نہیں ہاں حرارت ہے!"

ثریّا پھر مسکرائی:

"گھبرانے کی بات نہیں چلی جائے گی!"

اتنے میں زبیدہ آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد حمیدہ بھی آ گئی۔ اقبال اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ آئیں۔ ثریّا کی پیشانی کو بوسہ دیتیں۔ اور رونے لگتیں۔ آخر زبیدہ نے انھیں ٹوکا:

"خالہ جان، آپ تو میرے ہاتھ پاؤں بھی رُو رُو کر پھلائے دیتی ہیں!"

ثریّا بولی:

"امّی جان، آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ اوّل تو میں مروں گی نہیں؛ اور اگر مَر بھی گئی تو ——

بیگم صاحبہ نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا:

"خبردار جو آگے کچھ کہا۔ لو اور سنو۔ دُور پار ان کے دشمن مریں گے اور ہم بیٹھے قیامت تک پوربے سمیٹا کریں گے!"

کوئی دس بجے رات کو پھر اقبال آیا۔ چُپ چاپ آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اس نے زبیدہ سے پوچھا:

"انھوں نے کچھ کھایا؟"

زبیدہ نے کہا:

"نہیں ـــــــــ کھانے کے نام سے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں!"

ثریا مسکرا دی:

"ذرا بھی بھوک نہیں ہے!"

اقبال نے کہا:

"بھوک ہو یا نہ ہو، طاقت قائم رکھنے کے لیے غذا ضروری ہے۔"

پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہوا:

"ساگو دانہ بنا لائیے!"

زبیدہ اٹھ کر ساگو دانہ بنانے چلی گئی۔ حمیدہ سے اقبال نے کہا:

"اور دوا؟"

حمیدہ بولی:

"دوا بھی نہیں پیتیں!"

اقبال نے قدرے غصے سے کہا:

"اور تم نے سر تسلیم خم کر دیا؟ تم لوگ واقعی ان کی جان لے کر رہو گی!"

اقبال خود اٹھا۔ اپنے ہاتھ سے دوا بنائی، اور لے کر ثریا کے سامنے آیا:

"ذرا بھی بد مزہ نہیں ہے پی لیجیے!"

ثریا اُٹھ کر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ گئی۔ اقبال نے دوا دی۔ اس نے پی لی۔ پی کر مُنہ بنایا۔ اقبال نے فوراً پانی کا گلاس سامنے کر دیا۔ گلاس لے کر اس نے کُلّی کی۔ دوا پینے اور کُلّی کرنے میں وہ نڈھال ہو گئی۔ اقبال اور حمیدہ نے مل کر اسے تکیہ کے سہارے لِٹا دیا۔ اقبال نے حمیدہ سے کہا:

"ان کے لیے پان بنا لاؤ!"

حمیدہ پان بنانے چلی گئی۔ اقبال نے پھر نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس نے پوچھا:

"آپ بیمار کیوں رہنے لگی ہیں؟"

ثریا نے شوخ نظروں سے اقبال کو دیکھا، اور کمزور آواز میں کہا:

"میں تو بالکل بیمار نہیں ہوں۔ یہ سب زبیدہ کی شرارت، اور آپ کی عنایت ہے!"

اقبال نے کہا:

"زبیدہ کی شرارت میں تو شک کرنا کُفر ہے۔ لیکن میری عنایت سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

ثریا بولی:

"اچھے بھلے آدمی کو بھی تھرمامیٹر کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو وہ بیمار پڑ جائے گا۔ میں نہ ٹوکتی۔ تو آپ کا ہاتھ جیب تک جا چکا تھا!"

اقبال بھی مسکرا دیا، اور کہا:

"لیکن آپ نے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، بخار کو پال لیا ہے۔ کبھی بخار

کبھی حرارت، یہ ماجرا کیا ہے؟"

"مہمان کو دھکّا دے کر باہر نکال دینا، میری عادت نہیں!"

"تو بخار آپ کا مہمان ہے؟"

"ناخواندہ سہی، لیکن ہے تو!"

"لیکن آخر کیوں؟"

"یہ بھی میں بتاؤں؟ ڈاکٹر آپ ہیں یا میں؟"

اتنے میں حمیدہ پان لے کر آ گئی۔ ثریّا لیٹی رہی۔ حمیدہ نے اپنے ہاتھ سے پان اس کے منہ میں رکھ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اسے چبانے لگی۔

باب ۲۳

ہاں وہ نہیں وفا پرست

کئی ہفتے گزر گئے۔ مگر ثرّیا کی حالت میں کوئی فرق نہ ہوا۔ بلکہ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اب بخار ٹھہر گیا تھا۔ اگرچہ حکیموں اور ڈاکٹروں کی تجویز و تشخیص مختلف تھی۔ کوئی دق بتاتا تھا، کوئی سل تجویز کرتا تھا۔ کسی کی رائے تھی، سل بھی ہے اور دق بھی۔ اس اختلاف رائے کے باوجود سب اس پر متفق تھے۔ مریضہ کی حالت کافی تشویش انگیز ہے۔ یوں تو سارا گھر پریشان تھا۔ نواب صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑے ہوئے تھے۔ لیکن بیگم صاحبہ کا حال سب سے زیادہ نازک تھا۔ وہ بار بار ثرّیا کے کمرہ میں آتی تھیں۔ اور اسے پیار کرکے بلائیں لے کے چلی جاتی تھیں۔ وہ بار بار خدا سے دعا مانگتی تھیں، اس کی آئی مجھے آجائے۔ میں نے دنیا کا ہر رنگ دیکھ لیا، ہر حسرت پوری کر لی، لیکن میری بچّی نے ابھی کیا دیکھا ہے۔ ہائے میرے اللہ، اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟ انھوں نے ثرّیا کی چٹ چٹ بلائیں لیتے ہوئے کہا:

"میری بچّی، میں تجھ پر قربان۔ اب کیا حال ہے تیرا۔ کچھ تو منہ

سے بول!"

ثریّا نے کمزور آواز میں کہا:

"اچھی ہوں امّی، آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں!"

بڑی حسرت سے بیٹی کے مرجھائے چہرے کی طرف دیکھ کر بولیں:

"تو ماں کی ممتا کو نہیں جانتی، میری جان۔ اپنی ہزار جانیں تجھ پر قربان کر دوں۔ تو اچھی ہو جائے۔ یا اللہ رحم کر اپنی بندی پر!"

اور یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ حمیدہ کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ زبیدہ نے خالہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کی ہچکیاں اور سسکیاں، خالہ سے بھی دو قدم آگے تھیں۔ ثریّا کچھ دیر تک یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے زبیدہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"تم اگر ابھی سے اتنا رو لوگی، تو میرے بعد کیا کرو گی؟ کچھ آنسو میرے مرنے کے بعد کے لیے بھی تو رہنے دو!"

بیگم صاحبہ نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

نواب صاحب بڑی دیر سے دروازے میں کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ثریّا کے الفاظ سن کر وہ گرجتے ہوئے اندر آئے۔ اور ڈانٹ کر سب کو خاموش کیا، بیگم صاحبہ سے کہا:

"بیگم، تمھیں کیا ہو گیا ہے، اگر ثریّا کو خدانخواستہ کچھ ہوا تو اس کا خون تمھاری گردن پر ہو گا ——— تم لوگوں کا فرض ہے کہ اسے

تسلّی دو۔ اس کا حوصلہ بڑھاؤ۔ اس میں زندہ رہنے کی اُمنگ پیدا کرو۔ لیکن رو رو کر اپنے ساتھ میری کمزور اور بیمار بچّی کی جان بھی ہلکان کیے دے رہی ہو۔"

بیگم صاحبہ نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے، اور اُٹھ کر باہر چلی گئیں۔ نواب صاحب بیٹی کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئے، اور اس کی پیشانی پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

"اب کیا حال ہے بیٹی؟"

"اچھی ہوں ابّا حضور!"

"میں نے حکیم صاحب سے پوچھا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے، کوئی تشویش کی بات نہیں ہے، تم جلد اچھی ہو جاؤ گی!"

"مجھے بھی یہی اُمید ہے ابّا حضور!"

اتنے میں اقبال آ گیا۔ نواب صاحب نے کہا:

"بیٹا میں چاہتا ہوں کرنل اصغر سے بھی معائنہ کرا لو۔ پُرانے اور تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔ اور جس مرض کا شُبہ کیا جا رہا ہے، اس کے تو اسپیشلسٹ ہیں۔ کیا رائے ہے تمھاری؟"

"بجا فرمایا آپ نے، میں ابھی فون کرتا ہوں!"

اقبال فون کرنے چلا گیا۔ اور نواب صاحب اُٹھ کر زنان خانے میں پہنچے۔ اُنھوں نے بیگم صاحبہ سے کہا:

"دیکھو اب ایسی غلطی نہ کرنا ——— ثریّا پر ہرگز یہ ظاہر نہیں ہونا

GIRLS SECOND
LIBRARY

چاہیے کہ وہ خطرناک طور پر بیمار ہے۔ اگر اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تو وہ قیامت تک اچھی نہیں ہو سکتی۔ چاہے حضرت لقمان ہی کیوں نہ اس کا علاج کریں!"

بیگم صاحبہ پھر رونے لگیں:

"مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جاتی۔ چند روز میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ خدا اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ میں تو اسے دیکھ کر مایوس ہو جاتی ہوں!"

نواب صاحب جھنجلا کر بولے:

"پھر وہی باتیں! ذرا تو سمجھ سے کام لو۔ رونے دھونے سے کیا وہ اچھی ہو جائے گی؟"

اتنے میں کرنل اصغر آ گئے۔ اُنھوں نے بڑی دیر تک ثریّا کا معائنہ کیا۔ نواب صاحب کو اطمینان دے کر باہر آئے۔ اور اقبال کو الگ بُلا کر کہا:

"تم ڈاکٹر ہو، اس لیے تم سے کہتا ہوں، مریضہ کی حالت بہت نازک ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کیس ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ میں نے جو نسخہ لکھا ہے، اگر ہفتہ کے اندر حالت روبہ اصلاح ہو گئی، تو خیر، ورنہ پھر کوئی اُمّید نہیں۔"

اقبال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ کرنل اصغر کے جانے کے بعد نواب صاحب سے پوچھا:

"کیا کہہ رہے تھے؟"

اقبال نے جواب دیا:

"کہتے تھے کوئی خاص تشویش کی بات تو نہیں، لیکن مریضہ کو سکون اور آرام کی بے حد ضرورت ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں، ہر وقت وہاں ایک ہجوم سا رہتا ہے۔ اس سے صحت پر اور برا اثر پڑتا ہے!"

نواب صاحب نے کہا:

"تو پھر اسے نرسنگ ہوم بھیج دوں؟"

"نرسنگ ہوم کی رائے تو میں نہیں دوں گا۔ وہاں وہ آرام کہاں مل سکتا ہے، جو یہاں ہے۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ حمیدہ اور زبیدہ کے علاوہ ثریا کے کمرہ میں بغیر میری اجازت کے کوئی نہ جانے پائے خواہ وہ آپ ہی کیوں نہ ہوں!"

نواب صاحب نے فرمایا:

"میں سمجھ گیا، تمھارا اشارہ بیگم کی طرف ہے۔ میں نے انھیں سمجھا دیا ہے پھر سمجھا دوں گا۔ لیکن وہ بھی مجبور ہیں۔ اکلوتی اور جوان لڑکی، باپ کی آنکھ کا نور۔ ماں کے دل کا سرور۔ وہ دیکھتے دیکھتے سوکھ کر کانٹا بن جائے۔ زندگی کا چراغ جھلملانے لگے۔ تو کون سنگدل ہے جس کی آنکھیں پرآب نہ ہو جائیں گی!"

اور یہ کہتے کہتے نواب صاحب بھی بچوں کی طرح بلبلا کر رونے لگے۔ اب اقبال بھی آنسو ضبط نہ کر سکا اور جلدی سے آنسو پونچھتا ہوا

اندر چلا آیا۔

اور جس وقت یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ثریّا حمیدہ سے کہہ رہی تھی:

"اُلجھے ہوئے خیالات کو دُور کرنے، اور دل کے بہلانے کی بھی تمہیں کوئی ترکیب معلوم ہے؟"

حمیدہ بولی:

"کیوں نہیں، بہت سی!"

"مثلاً!"

"سیر و تفریح، ناچ گانا ——— گانے میں تو جادو کا اثر ہوتا ہے!"

ثریّا کچھ دیر تک کسی خیال میں غرق رہی۔ پھر اس نے کہا:

"سچ کہتی ہو حمیدہ ——— تو کچھ سناؤ، تاکہ وقت کٹے۔ اور دل بہلے!"

حمیدہ نے بے بسی کے ساتھ کہا:

"مَیں سُناؤں؟"

"ہاں تم ——— کہہ دو مجھے گانا نہیں آتا!"

حمیدہ بولی:

"گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ لیکن مَیں بہت معمولی سا گانا جانتی ہوں!"

"کوئی حرج نہیں سُناؤ!"

حمیدہ نے غالب کی مشہور غزل چھیڑی ؎

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں

یہ غزل حمیدہ نے کچھ ایسے طرز اور ایسی لئے میں گائی کہ ایک سماں سا بندھ گیا۔ سننے والی اور گانے والی دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اور زبیدہ دروازے کی اوٹ میں چُپ چاپ یہ منظر دیکھ رہی تھی!

باب ۲۴

نیا علاج

نواب صاحب اور بیگم صاحبہ پریشان و مضطرب آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ اب دونوں نے محسوس کر لیا ہے، ثریّا کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ چند دن کی مہمان ہے۔ بڑے بڑے حکیم اور ڈاکٹر بھی مایوس ہو چکے ہیں۔ ثریّا ان دونوں کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کی ذات سے ان دونوں بوڑھوں کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اس کی زندگی سے یہ دونوں زندہ تھے۔ اگر وہ دن آگیا کہ وہ نہ رہی، تو پھر کیا ہوگا؟

نواب صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بیگم صاحبہ سے کہا

"اب کیا ہوگا بیگم؟"

وہ بے قرار ہو کر بولیں:

"مَیں نہیں جانتی —— اپنی ثریّا کو میں آپ سے لوں گی۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے بیگم کے آنسو پونچھے اور کہا:

"انسان کے بس میں جو کچھ ہے۔ وہ سب میں کر چکا۔ اب کیا کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

کون سی کی نہ دوا کون سی مانگی نہ دُعا
ہم نے کیا کیا نہ کیا تیرے سنبھلنے کے لئے

نواب صاحب کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ انھوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"کاش میں اپنی زندگی ثریّا کو دے سکتا!"

بیگم نے روتے روتے کہا:

"اور میں بھی ——— میں نے تہجد پڑھ پڑھ کے اس کی سلامتی کی گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہیں۔ خیرات کی ہے۔ صدقہ کیا ہے۔ قربانی کی ہے۔ روزے رکھے ہیں۔ اس کے پلنگ کے گرد پھیرے لگا کر، اپنی زندگی اسے دی ہے۔ اور اس کی بیماری خود مانگی ہے لیکن کسی بات کا بھی کچھ اثر نظر نہیں آتا۔ میری ثریّا کی حالت میں کچھ فرق نہیں اور میں ویسی کی ویسی بیٹھی ہوں!"

نواب صاحب ابھی کوئی جواب نہ دے پائے تھے کہ زبیدہ گھبرائی ہوئی اندر آئی اور آتے ہی پکاری:

"خالہ جان، خالہ جان!"

اور قبل اس کے کہ خالہ جان کوئی جواب دیں، وہ ان کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ نواب اور بیگم کے پاؤں کے نیچے سے زبیدہ کو روتے دیکھ کر زمین نکل گئی۔ انھیں اندیشہ ہوا کہیں ثریّا ——— کہیں ثریّا اس دنیا سے رخصت تو نہیں ہو گئی۔ نواب صاحب نے پوچھا:

"زبیدہ ثریّا کیسی ہے؟"

بیگم بولیں:

"میری ثریّا کا کیا حال ہے زبیدہ؟"

زبیدہ نے کہا:

"کیا بتاؤں خالہ —— مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جاتی۔ بچا لیجیے، خدا کے لیے بچا لیجیے اسے!"

بیگم بولیں:

"زبیدہ کیا کہہ رہی ہے تو؟ ہزار جانیں ہوں تو قربان کر دوں اپنی ثریّا پر، کچھ بتاؤ تو سہی!"

زبیدہ نے ایک اضطراب کے عالم میں کہا:

"اگر اس کا علاج ٹھیک نہ ہوا، تو وہ اس دُنیا سے خفا ہو کر چلی جائے گی!"

نواب صاحب نے کہا:

"ٹھیک علاج؟ تم کیا کہہ رہی ہو زبیدہ؟ ہم نے ثریّا کے علاج پر پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے۔ ہم اپنا سارا تعلّقہ اس پر قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ شہر کے بڑے سے بڑے حکیم اور چوٹی کے ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے ہیں، اور کیا چاہتی ہو تم؟"

بیگم صاحبہ بولیں:

"میں یہ محل دے دوں گی۔ میں یہ تعلّقہ دے دوں گی۔ میں یہ زیورات

یہ ملبوسات، یہ روپیہ، یہ سونا، یہ چاندی، ہر چیز اپنی بچّی پہ نچھاور کردوں گی۔ لیکن کوئی اسے بچا لے!"

زبیدہ بولی:

"ثریّا کا علاج صرف اقبال کے پاس ہے!"

بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا:

"کچھ باؤلی ہوئی ہے لڑکی۔ اتنے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کے مقابلہ میں اقبال کل کا چھوکرا کیا کرسکتا ہے؟"

زبیدہ نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا:

"میں پھر کہتی ہوں۔ ثریّا کا علاج اقبال کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ وہی اس کا طبیب ہے۔ وہی اس کا مسیحا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں اس کی جان ہے!"

نواب صاحب نے ذرا بگڑ کر کہا:

"صاف صاف کہو!"

زبیدہ بولی:

"وہ جان و دل سے اقبال کو چاہتی ہے، پُوجتی ہے، لیکن شریف اور صابر لڑکی ہے۔ حرفِ محبت زبان پر نہیں لاتی۔ اسی غم میں گھُلی جاتی ہے۔ خالو آبا اب وقت ضائع نہ کیجیے!"

نواب صاحب نے ایک نظر زبیدہ پر ڈالی، اور پوچھا:

"کیا واقعی؟"

زبیدہ بولی :

" ہاں خالو جان ، بالکل سچ ! "

بیگم صاحبہ بھی اس خبر کے سننے کے لیے تیار نہ تھیں :

" تو کیا کہہ رہی ہے زبیدہ ! "

زبیدہ نے جواب دیا :

" ایک ایک بات سچ کہہ رہی ہوں ، تدارک کیجیے ، ورنہ ہاتھ ملیے گا پچھتائیے گا ! "

نواب صاحب نے گرج دار آواز میں کہا :

" اگر چہ یہ سچ ہے ، تو ہم نے بڑا ظلم کیا ، اپنی بچّی پر۔ وہ شرم و حیا کی تصویر پتھر کا کلیجہ بنا کر غم کے اس طوفان کو سہتی رہی۔ "

بیگم صاحبہ نے کہا :

" یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ابھی انتظام کرتی ہوں۔ کل ہی ہو جائے گی شادی ! "

نواب نے بیگم سے کہا :

" تم اقبال کو میرے پاس بھیج دو ! "

اور جس وقت زبیدہ ، بیگم اور نواب کی یہ کانفرنس ہو رہی تھی۔ حمیدہ بدحواس افتاں و خیزاں ایک شیشے کے گلاس میں دم کیا ہوا پانی لے کر ثریّا کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اتنے میں اقبال سامنے آ گیا۔ اس نے پوچھا :

"کہاں جا رہی ہو حمیدہ؟"

وہ بولی:

"ثریا کے پاس ـــــــ خدا رحم کرے، حالت بہت نازک ہے۔ آپ بھی دعا کیجیے۔"

اقبال نے کہا:

"میرا رواں رواں ثریا کی سلامتی کے لیے دست بہ دعا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ نہ رہی، تو ہماری زندگی بھی تلخ اور بے کار ہو جائے گی۔"

حمیدہ نے کہا:

"چار ہی دن میں نقشہ بدل گیا۔ گلاب کا پھول سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے؟"

حمیدہ پانی لے کر چلی گئی۔ اور اقبال وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ ثریا کی علالت سے بہت فکرمند تھا۔ وہ جانتا تھا۔ خطرہ سر پہ منڈلا رہا ہے۔ اور ثریا کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی، وہ اپنے دل کو تسلی دیتا رہتا تھا، کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ زندہ رہے گی۔ لیکن حمیدہ کی تصویر کشی نے اس کے دل کو ہلا ڈالا۔ وہ اسی خیال میں غرق کھڑا تھا کہ بیگم آئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُنھوں نے آتے ہی اقبال کی بلائیں لیں۔ اور کہا:

"بیٹا، ثریا ہمیشہ سے تمھاری تھی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اس کا دامن تھام لو۔ وہ اس دنیا سے روٹھ کر بھاگی جا رہی ہے۔ تم ہی اسے منا سکتے ہو۔

صرف تم اسے روک سکتے ہو۔ وہ صرف تمھاری ہی بن کر زندہ رہ سکتی ہے۔ میرے بچے!"

اقبال مبہوت بنا، یہ باتیں سُن رہا تھا۔ پھر اس نے حواس مجتمع کرکے کہا:

"یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟ میری جان بھی اگر ثریا کے کام آجائے تو مجھے دریغ نہ ہوگا۔ بلکہ میرے لیے باعثِ فخر ہوگا۔ لیکن میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ انعام میری اوقات سے بڑھ کر ہے!"

بیگم نے گلوگیر آواز میں کہا:

"تم کس لائق ہو، یہ ہمارے دل سے پوچھو۔ ایک آنکھ تم ہو، دوسری ثریا۔ بیٹا تمھیں نواب نے بلایا ہے۔ جاؤ!"

بیگم چلی گئیں۔ اور ان کے جاتے ہی حمیدہ با چشمِ پُرنم داخل ہوئی۔ اقبال نے کہا:

"خیریت؟"

وہ بولی:

"خدا وہ دن لائے!"

اقبال نے پوچھا:

"تمھاری آنکھ میں آنسو کیسے ہیں! ثریا کا کیا حال ہے؟"

حمیدہ نے کہا:

"وہی! بلکہ اور زیادہ بدتر۔ خدا رحم کرے۔ مجھ سے یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

زندگی بدلی جا سکتی ہوتی تو میں اپنی زندگی ثریا سے بدل لیتی!"

ایک جذبے کے عالم میں اقبال نے کہا:

"یہ ہو سکتا، تو اقبال تم سے پیچھے نہ رہتا

لیکن اب ایک دوسرا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ ایک طرف فرض ہے، ایک طرف محبت!"

اقبال کو فکرمند دیکھ کر حمیدہ نے کہا:

"میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ تم سوچ کیا رہے ہو؟ آج وقت آیا ہے کہ تم اس خاندان کے احسان سے سبکدوش ہو جاؤ —— تم میری فکر نہ کرو۔ میں تمھیں خوشی سے اجازت دیتی ہوں۔ ثریا کو سہاگن دیکھ کر جتنی راحت مجھے ہوگی۔ وہ شاید اپنے سہاگ کو دیکھ کر بھی نہیں ہو سکتی!"

اقبال نے کہا:

"تم میری مدد کرو حمیدہ، بتاؤ میں کیا کروں؟"

حمیدہ بولی:

"میں تمھیں اپنی محبت کا واسطہ دیتی ہوں، ثریا سے شادی کر لو۔ تمھارا یہ احسان مجھ پر ہوگا۔ میں اس صبر کی دیوی کو مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں کہو۔ کہہ دو ہاں۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ تم میرے ہو۔ اور میں بڑی خوشی کے ساتھ تمھیں اپنی ثریا کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔ جاؤ، نواب صاحب تمھارا انتظار کر رہے ہوں گے!"

اقبال خاموشی کے ساتھ نواب صاحب کے دیوان خانے میں چلا گیا۔ وہ منتظر بیٹھے تھے۔ اقبال سامنے آکر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ نواب صاحب نے آنکھ کے اشارہ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر نواب صاحب نے کہا :

"اقبال جانتے ہو، میں نے تمھیں کیوں بلایا ہے؟"

اقبال نے کہا :

"آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، آپ جو حکم دیں گے، میں دل و جان سے اس کی تعمیل کروں گا۔"

نواب صاحب نے کہا :

"شاباش تم سے مجھے یہی اُمید تھی —— تم میرے عصائے پیری ہو، تمھی سے میری ساری اُمیدیں وابستہ ہیں!"

اقبال خاموش بیٹھا رہا۔ نواب صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

"میں چاہتا ہوں، اپنے آخری فرض سے سبکدوش ہو جاؤں!"

اقبال نے کہا :

"خدا آپ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔ آپ "آخری" کا لفظ نہ استعمال کیجیے!"

نواب صاحب نے کہا :

"بیٹا، میں چاہتا ہوں، ثریا کی شادی تمھارے ساتھ کر دوں!"

اقبال نے کوئی جواب نہ دیا۔ نواب صاحب نے دریافت کیا:

"تمھیں میری اس تجویز سے اختلاف تو نہیں؟"

اقبال نے کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر جواب دیا:

"آپ کے ہر حکم کی تعمیل میرا سب سے بڑا فریضہ ہے!"

نواب صاحب بولے:

"تمھارا جواب توقع کے مطابق ہے ———— اب تم جا سکتے ہو، میں انتظامات کرتا ہوں۔ ممکن ہے کل ہی یہ تقریب انجام پا جائے۔"

اقبال نواب صاحب کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا۔ اس کے پاؤں دو دو من کے ہو رہے تھے۔ وہ ثریّا کو بچانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کر سکتا تھا۔ نواب کے، بیگم کے، ثریّا کے، اس پر اَن گنت احسانات تھے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اپنی ذاتی خوشی پر وہ اس خاندان کی خوشی کو ترجیح نہ دیتا۔ لیکن جہاں ایک طرف اس کا دل اس احساس سے مسرور تھا۔ کہ فرض کے ادا کرنے کا جب وقت آیا تھا اس کے پاؤں ڈگمگائے نہیں۔ وہاں یہ احساس اس کے دل میں چٹکیاں بھی لے رہا تھا۔ اب حمیدہ اس سے ہمیشہ کے لیے چھن گئی۔ وہ حمیدہ جو اس کے تصوّر میں بسی ہوئی تھی۔ جو اس کی زندگی بن چکی تھی جسے دیکھ دیکھ کر وہ جیتا تھا۔ زندگی کے پروگرام بناتا تھا۔

جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ تو حمیدہ موجود تھی۔ آج کی حمیدہ، پہلے کی حمیدہ سے بالکل مختلف تھی۔ وہ شرم، وہ جھجک! وہ رکھ رکھاؤ آج اس میں

نہیں تھا۔ جو اس کی فطرت بن چکا تھا۔ آج کی حمیدہ بے باک تھی، اور وہ آزادی کے ساتھ اقبال سے باتیں کر رہی تھی۔ حمیدہ نے پوچھا:

"آ گئے ؟"

"ہاں !"

"کیا ہوا ؟"

"وہی جو تم نے کہا تھا !"

"پھر تمھارا چہرہ اُترا ہُوا کیوں ہے ؟ تمھاری آنکھیں ڈبڈبا کیوں رہی ہیں ؟ تم خوش کیوں نہیں نظر آتے ؟"

"کیا مجھے یہ بھی کرنا ہوگا !"

"ہاں ! ——— اور اگر تم یہ نہ کر سکے تو میری آنکھوں سے تم اپنی عزّت کھو دو گے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور زندگی کی آخری سانس تک کرتی رہوں گی۔ لیکن اگر میں نے تمھیں احسان فراموش، خود غرض اور بزدل پایا، تو میری محبت نفرت سے بدل جائے گی !"

اقبال نے حیرت سے حمیدہ کو دیکھا۔ اور کہا:

"یہ تم کہہ رہی ہو ؟"

"ہاں ! میں کہہ رہی ہوں"

"تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی، تم ؟"

"ہاں، اگر تم میری محبّت کے اہل نہ ثابت ہو سکے"

"لیکن اہلیت کا ثبوت کس طرح دوں ؟"

"خوش دلی کے ساتھ اپنا فرض انجام دے کر ——— اقبال ایک بات نہ بھولو!"

"وہ بھی کہہ ڈالو، کہو!"

"عورت کا دل مرد کے دل سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور ہوتی ہے۔ میں عورت ہوں، تم مرد ہو۔ تمھارے قدم اگر ڈگمگا گئے تو میں کیا کروں گی؟ کیا تم مجھ سے سبق نہیں حاصل کر سکتے!"

"کیوں نہیں، کر رہا ہوں!"

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ دنیا کا ہر رشتہ فانی ہے۔ لیکن محبت پر فنا کبھی نہیں طاری ہو سکتی۔ ہم ایک دوسرے کے محب اور محبوب بن کر بھی اگر ایک دوسرے کے جسم کے مالک نہ بن سکیں تو کوئی قیامت نہ آ جائے گی۔ سچ پوچھو تو ہماری محبت اب کسوٹی پر پرکھی جا رہی ہے۔ محبت کے بعد، اگر جسم کی ملکیت حاصل ہو جائے، تو محبت فاتح تو بن جاتی ہے، لیکن امتحان کی آگ میں اسے تپنے کا موقع نہیں ملتا۔ ہمیں یہ موقع ملا ہے۔ اس سے ہمیں گھبرانا نہ چاہیے!"

اقبال نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:

"ایسا ہی ہوگا حمیدہ!"

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں!"

"قائم رہوگے اپنی بات پر؟"

"ضرور!"

"پھر تمھاری محبت مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ زندگی کے آخری لمحہ تک، حمیدہ اقبال کے سوا کسی کی نہیں بن سکتی ——— مَیں تمھیں زندگی کے اس نئے دَور پر مبارک باد دیتی ہوں!"

اقبال نے پریشان ہو کر کہا:

"فلسفہ ختم ہُوا۔ اب طنزیات کی باری ہے؟ کیا تم مجھے زندہ نہ رہنے دو گی؟"

حمیدہ نے کہا:

"مَیں طنز نہیں کرتی۔ تم امتحان میں پورے اُترے۔ میں سچّے دل سے تمھیں مبارک باد دیتی ہوں۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا!"

"وہ کیا بات ہے؟"

"ثریا کو کبھی بھی یہ نہ محسوس ہونے دینا کہ یہ مارے باندھے کی شادی ہے، تم اسے نہیں چاہتے، کسی اور کو چاہتے ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا!"

حمیدہ اور اقبال میں باتیں ہو رہی تھیں کہ ملازمہ آئی۔ اس نے اقبال سے کہا:

"نواب صاحب نے بُلایا ہے!"

اقبال باہر چلا گیا۔ مجلس منتشر ہو گئی۔

باب ۲۵

شادی و غم

حمیدہ، زبیدہ اور بیگم صاحبہ، ثریّا کے کمرہ میں اس کے پاس بیٹھی ہیں۔ چند خادمائیں بھی ملول و افسردہ کھڑی ہیں۔ سب کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ باہر سے شہنائی کی آواز آ رہی ہے۔ شادیانے بج رہے ہیں۔ گولے داغے جا رہے ہیں۔ پٹاخے چھوڑے جا رہے ہیں۔ شاہانہ دعوت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ نواب صاحب ایک کرسی پر دراز، حُقّہ پی رہے ہیں۔ آس پاس ندیم اور مصاحب بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا:

"حضور، جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"

نواب صاحب نے کہا:

"ہاں ہاں کہیے کیوں نہیں؟ کہو!"

وہ بولا:

"اس محل میں جب کبھی شادی بیاہ ہُوا ہے، ساری خلقت اُمنڈ آئی ہے۔ ثریّا بیگم کے لیے تو ہم نے سمجھا تھا۔ سارے مُلک کو دعوت دی جائے گی۔ لیکن یہاں تو حضور کے متوسلین

کے سوا کوئی اور نظر نہیں آیا۔ ہم جیسے خانہ زاد ہیں، یا قدیم ملازم یا چند مخصوص احباب!"

نواب صاحب نے کہا:

"بھئی بات یہ ہے کہ یہ شادی شادی نہیں ہے، شادی کی تمہید ہے۔ ثریا نصیب دشمناں سخت بیمار ہے، وہ ذرا اچھی ہو لے، تو پھر دھوم دھام دیکھنا جی بھر کے!"

مصاحب نے عرض کیا:

"تو حضور، ہمارے ہاں تو شگون اور زائچہ نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تقریب غسل صحت کے بعد ہو سکتی تھی!"

نواب صاحب بولے:

"ٹھیک کہتے ہو بھئی، مگر بات یہ ہے کہ لڑکی کی ماں بضد ہیں کہ جلد از جلد یہ رسم انجام پا جائے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ نکاح ہوتے ہی بیماری چلی جائے گی —— عورتوں کو تم جانتے ہی ہو ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ میں نے بھی کہا۔ یہی سہی۔ چلو ذرا گھر کی فضا ہی بدل جائے گی!"

مصاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑا:

"اے سبحان اللہ کیا تدبیر ہے۔ خدا حضور کو سلامت رکھے، واقعی ٹھیک بات ہے؟"

دوسرے مصاحب نے کہا:

"شادی کی تمہید! کیا خوب جملہ ارشاد فرمایا۔ فصاحت بلائیں لیتی ہے۔ بلاغت قربان ہوتی ہے۔ ہمارے نواب والا شان پر!"

اور گھر کے اندر کی غم انگیز فضا بدستور قائم تھی۔ ثریا اس وقت نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ اور حمیدہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں گئیں۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ثریا نے آنکھیں کھولیں۔ اور کمزور آواز میں زبیدہ سے کہا:

"شہنائی کی آواز؟"

زبیدہ بولی:

"ہاں میری ثریا، یہ شہنائی کی آواز ہے!"

"شادیانے؟"

"ہاں میری بہن، شادیانے بج رہے ہیں!"

"یہ کیا ہو رہا ہے زبیدہ؟ شادی ہے کسی کی؟"

"ہاں شادی ہے ـــــ بیاہ رچایا جا رہا ہے!"

ثریا نے نحیف آواز میں پوچھا:

"بیاہ؟ کس کا بیاہ؟"

زبیدہ نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا:

"اٹھ میں تجھے دلہن بناؤں، تیرا بیاہ ہے اقبال سے!"

ثریا سمجھ گئی، معاملہ کیا ہے۔ اس نے جھنجھلا کر کہا:

"یہ تمھاری شرارت ہے زبیدہ!"

"یہی سمجھ لو!"

وہ غصّہ سے بولی:

"لیکن یہ نہیں ہو سکتا!"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ ثریّا پاگل نہ بنو!"

ثریّا بولی:

"کیا میری شرافت اور انسانیّت کا تقاضا یہی ہے کہ دو محبّت کرنے والے دلوں کو ملنے نہ دوں؟ ان کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاؤں؟"

زبیدہ نے حیرت سے ثریّا کو دیکھا اور کہا:

"تم اقبال سے محبت نہیں کرتیں؟"

"ہرگز نہیں کرتی، بالکل نہیں کرتی۔ میں نے تم سے کب کہا کہ میں اقبال سے محبّت کرتی ہوں؟ اور فرض کرلو، تھوڑی دیر کے لیے کرتی ہوں تو؟ کیا میری محبّت کا تقاضا یہ ہے۔ یہ ہونا چاہیے کہ اپنی محبّت کی قربان گاہ پر اقبال اور حمیدہ کو بھینٹ چڑھا دوں؟ ان کی محبّت کا گلا دبا دوں؟ یہ محبت ہوئی یا زبردستی اور دھاندلی؟"

زبیدہ نے کہا:

"برداشت کرلوگی، کہ اقبال کی شادی کسی اور سے ہو جائے۔ ہائے میرے اللہ تیرا دل ہے یا پہاڑ؟"

ثریّا نے بیزاری کے ساتھ کہا :

" پھر وہی باتیں ـــــــ محبّت کے لیے آخر شادی کیوں ضروری ہے؟ کیا شادی کے بغیر محبّت نامکمّل رہتی ہے؟ محبّت اپنی جگہ ہے اور شادی اپنی جگہ ـــــــ تم مجھے بالکل غلط سمجھیں۔ تم نے میرا بالکل غلط روپ لوگوں کے سامنے رکھا۔ تم بڑی احمق ہو۔ زبیدہ آج مجھے معلوم ہُوا، نادان کی دوستی، واقعی دشمنی ہوتی ہے۔"

زبیدہ نے عاجز آ کر کہا :

" تم جیسی قابل فاضل عورت سے کون سر مغزی کرے؟ ہم نے تو اپنی ہار مان لی! ارے ہاں، ہم تو کریں ہمدردی اور تم نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ بکنے لگو۔"

ثریّا بولی :

" تمھاری ہمدردی کا شکریہ، لیکن جو بات تم جانتی نہیں، اس میں اُلجھتی کیوں ہو؟"

زبیدہ بگڑ اٹھی :

" تم جو کچھ بھی کہو، یہ شادی تو ہو کر رہے گی۔ جو آگ تمھیں بھسم کیے دے رہی تھی، اسے اب میں نہیں سلگنے دوں گی!"

ثریّا نے کہا :

" یہ نہ کہو ـــــــ یہ کہو، جو آگ تجھے جلا رہی تھی۔ اسے اب میں شعلہ بنا کر، آن کی آن میں تجھے خاکستر بنا دوں گی ـــــــ

شاید میں چند دن اور زندہ رہ جاتی، لیکن اب میں نہیں بچ سکتی۔ سچ ہے موت کا وقت مقرر ہے۔ وہ آ گیا ہے۔ اور اب اسے کوئی نہیں ٹال سکتا!"

اتنے میں بیگم صاحبہ اور حمیدہ خادماؤں کے جھرمٹ میں بیاہ کا جوڑا لے کر داخل ہوئیں۔ بیگم نے ثریا سے کہا:

"میری بچی تو جگ جگ جیئے۔ دودھوں نہائے، پوتوں پھلے۔ یہ شاہانہ جوڑا لائی ہوں۔ میں تجھے اپنے ہاتھ سے دلہن بناؤں گی!"

ثریا نے زبیدہ کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ ثریا نے بیگم صاحبہ سے بچوں کی طرح ہمک کر کہا:

"میں خود اپنے ہاتھ سے پہنوں گی، یہ جوڑا، اکیلے میں!"

بیگم صاحبہ بولیں:

"خدا تیری مرادیں پوری کرے۔ بی بی، آؤ زبیدہ چلیں!"

سب لوگ واپس جانے لگے۔ تو ثریا نے حمیدہ سے کہا:

"تم کہاں چلیں؟"

وہ کھڑی ہو گئی:

"بیٹھ جاؤ!"

وہ بیٹھ گئی۔

"جاؤ دروازہ اندر سے بند کر لو!"

وہ دروازہ اندر سے بند کر آئی۔

ثریا نے کہا:

"جوڑا نکال کر میرے سامنے لاؤ!"

حمیدہ نے چاندی کی کشتی میں سے سہاگ کا جوڑا اور زیورات نکالے اور لا کر سامنے رکھ دیے۔

ثرّیا نے حمیدہ سے کہا:

"تم اُداس کیوں ہو؟"

حمیدہ بولی:

"بالکل نہیں، مَیں تو بہت خوش ہوں!"

"یہ جوڑا کیسا ہے؟"

"اچھا، بہت اچھا، بالکل آپ کے لائق!"

ثرّیا نے دوپٹہ ہاتھ میں اُٹھا کر حمیدہ کو دکھایا:

"یہ کیسا ہے؟"

"بڑا خوبصورت۔ یہ سلمہ، یہ ستارہ، یہ جگ مگ کرتے ہوئے سونے چاندی کے تار، کتنے اچھے ہیں، کتنے پیارے!"

ثرّیا نے قمیص اُٹھائی۔

"اور یہ؟"

"اس کی تو تعریف نہیں ہو سکتی!"

ثرّیا نے غرارہ اُٹھا کر دکھایا

"اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"اس کی بھی تعریف نہیں ہو سکتی!"

پھر ثریا نے زیورات حمیدہ کی طرف بڑھا دیے :

"یہ کیسے ہیں ؟"

"ایسے زیور شہر میں کسی کے ہاں مشکل سے نکلیں گے۔ خدا آپ کو مبارک کرے !"

ثریا کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اس نے کہا :

"مجھے تو نہ یہ جوڑا پسند ہے، نہ زیور !"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟"

"سچ، اماں کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ میرا سب سے اچھا جوڑا چھپا کر رکھ چھوڑا۔ اور یہ معمولی سا لے آئیں ہیں یہ نہیں پہنوں گی میں تو وہی پہنوں گی۔"

"وہی سہی !"

"لیکن یہ کپڑے کیا ہوں گے ؟"

"ہوں گے کیا، سینت کے رکھ دیے جائیں گے۔ پھر کبھی پہن لیجیے گا۔"

"کیوں ری حمیدہ، میری شادی ہے۔ تو میلے کپڑوں میں گھوم رہی ہے پھر کہتی ہے کہ تو خوش ہے ؟"

"پہلے آپ پہن لیجیے۔ پھر میں بھی جا کر بدل آؤں گی کپڑے !"

"نہیں، تو یہ پہن لے، میں دوسرا جوڑا پہنوں گی !"

حمیدہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ ثریا نے کہا :

"تم نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہی ہوں ؟"

"سنا تو !"

"پھر تعمیل کیوں نہیں کرتیں؟"

"آپ کا جوڑا کیسے پہن لوں؟"

"کیوں؟ کیا یہ ناپاک ہے؟"

"توبہ توبہ، ناپاک کیوں ہوتا؟"

"ناپسند ہے؟"

"یہ لیجیے، ناپسند کیوں ہونے لگا؟"

"پھر کیوں نہیں پہنتیں؟ پہن لو!"

"بیگم صاحبہ خفا ہوں گی!"

"میری خوشی سے وہ خفا ہوں گی؟ تم مجھ سے زیادہ انھیں جانتی ہو؟"

حمیدہ لاجواب ہو گئی۔ اور آخر کار اسے وہ جوڑا طوعاً و کرہاً پہننا پڑا۔ جب وہ پہن چکی، تو ثریّا نے کہا:

"اور یہ زیور؟"

"یہ آپ پہنیے گا!"

"پھر وہی — میں کہہ چکی، مجھے نہ یہ جوڑا پسند ہے، نہ یہ زیور، پہنو، جلدی کرو!"

حمیدہ ثریّا کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی۔ زیور بھی اس نے بادلِ ناخواستہ پہن لیے۔ یوں بھی وہ کم خوبصورت نہ تھی۔ لیکن اب تو سونے پہ سہاگہ والا معاملہ تھا۔ ثریّا اسے دیکھ کر مسکرائی، اور بولی:

"بالکل دلہن معلوم ہوتی ہو!"

حمیدہ کے انکار اور ثریّا کے اصرار میں کافی وقت صرف ہو گیا تھا۔ بیگم صاحبہ سے منضبط نہ ہو سکا۔ اُنھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا :

"میری بچّی دروازہ کھول !"

حمیدہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

"اب کیا ہوگا ؟"

"کچھ نہیں —— دیکھ کیا ہوتا ہے ! —— چُپکے سے کھٹکا کھول کر میرے پاس آجا۔ مُنہ میری طرف کر بیٹھ دروازہ کی طرف !"

حمیدہ نے اس حکم کی لفظ بہ لفظ تعمیل کی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر بیگم صاحبہ نے پُکارا :

"ثریّا بیٹی !"

ثریّا نے جواب دیا :

"آجائیے !"

بیگم صاحبہ اور زبیدہ اندر آئیں۔ اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ حمیدہ دُلہن بنی بیٹھی ہے۔ اور ثریّا ویسی ہی۔ بیگم نے پوچھا :

"یہ کیا بیٹی ؟"

پھر وہ حمیدہ سے مخاطب ہوئیں :

"تجھے یہ بدشگونی کرتے شرم نہ آئی ؟"

ثریّا نے کہا :

"امّاں، اگر آپ نے حمیدہ کو کچھ کہا، تو میں اپنا سر پھوڑ لوں گی۔ اس نے جو

کچھ کیا ہے، میرے حکم سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ یہ کپڑے میں نے اسے پہنائے ہیں۔ یہ زیور میں نے اسے دیا ہے!"

ثریّا رونے لگی۔ بیگم صاحبہ نرم پڑ گئیں۔ انھوں نے کہا:

"اسے پہنا دیے۔ یہ زیور اسے دے دیا۔ لیکن تو کیا کرے گی؟ تو کیا پہنے گی؟"

"مجھے یہ جوڑا پسند نہ تھا۔ میں نے دے دیا۔ میں دوسرا پہنوں گی!"

"چل میرے ساتھ، جو پسند ہو وہ نکال لا!"

"ابھی نہیں، پھر کسی وقت!"

"پھر کسی وقت؟ بیٹیا قاضی جی آ چکے ہیں۔ نکاح ہو رہا ہے تیرا!"

ثریّا نے تن کر کہا:

"ہاں نکاح ہوگا، ضرور ہوگا، لیکن میرا نہیں حمیدہ کا۔ میں اقبال سے شادی نہیں کر سکتی!"

بیگم پر ہمالیہ پہاڑ گر پڑا۔

"کیوں بیٹی؟"

"بھائی اور بہن میں شادی نہیں ہو سکتی۔ میں اقبال کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ بہن بھائی سے شادی کر لے۔ یہ اندھیر کبھی ہوا ہے اس دنیا میں!"

بیگم صاحبہ لاجواب ہو کر رونے لگیں:

"تو میں نے جو کچھ سُنا تھا، سب جھوٹ تھا؟"

"بالکل جھوٹ، سراسر افسانہ!"

بیگم نے غصّہ بھری نظروں سے زبیدہ کو دیکھا۔

" زبیدہ ؟"

ثریّا بولی :

" اسے کچھ نہ کہیئے، اسے معاف کر دیجیے۔ یہ بے وقوف ہے !"

کچھ دیر تک سنّاٹا سا رہا۔ پھر ایسا معلوم ہوتا تھا، سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ثریّا بولی :

" امّاں، اقبال اور حمیدہ کی شادی ابھی ہونی چاہیئے !"

وہ بے دلی سے بولیں :

" ہو جائے گی، جلدی کیا ہے ؟"

" ہے —— ابھی ہو گی، فوراً ! آپ اگر یہ چاہتی ہیں کہ میرا روگ دُور ہو جائے، تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اقبال اور حمیدہ کی شادی۔ ابھی کچھ دیر میں زندہ رہنا چاہتی ہوں کیا آپ میری یہ آخری تمنّا پوری نہیں ہونے دیں گی ؟ میں اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ موت کا فرشتہ میرے پاس بیٹھا ہے۔ میں اب کوئی دم کی مہمان ہوں۔ امّاں، وقت بالکل نہیں ہے، جلدی کیجیے !"

بیگم نے کہا :

" بیٹی، میرے کلیجہ پر تیر نہ مار۔ ایسی باتیں نہ کر۔ تیری خوشی کے لیے میں آسمان کے تارے توڑ لا سکتی ہوں۔ تُو اقبال سے شادی نہیں کرنا چاہتی، نہ کر۔ تو حمیدہ اور اقبال کی شادی پسند کرتی ہے۔ یہی ہو گا۔

ابھی ہوگا۔ لیکن وعدہ کر زندہ رہے گی، مرے گی نہیں!"

ثریا نے کہا:

"اماں یہ وعدہ میں کس طرح کر سکتی ہوں۔ مگر ہاں یہ وعدہ کر سکتی ہوں کہ اگر آپ نے میری تمنا پوری کر دی تو میں خوشی سے مروں گی، کوئی حسرت اپنے ساتھ نہ لے جاؤں گی ——— لیکن اماں، میری حالت غیر ہو رہی ہے۔ میرے بدن میں سستی ہو رہی ہے۔ میرے پاؤں ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ......

اب بیگم صاحبہ صورت حال کو اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے آنسو روک لیے۔ اور بڑے استقلال سے کہا:

"ابھی لے، جو تُو کہہ رہی ہے وہ ابھی ہوگا!"

وہ فوراً باہر آئیں۔ نواب صاحب کو بُلایا۔ وہ گھبرائے ہوئے آ گئے۔ بیگم نے پوچھا:

"اقبال دولھا بن گیا!"

"ہاں بن گیا؟"

"قاضی صاحب آ گئے؟"

"آ گئے!"

"اقبال سے ثریا کی نہیں، حمیدہ کی شادی ہو گی۔ اقبال اور قاضی جی دونوں کو بتا دیجیے!"

"یعنی کیا؟"

"میں نے جو کچھ کہا، وہ آپ سُن چکے ہیں۔ میرا اور اپنا وقت نہ ضائع کیجیے ثریّا مر رہی ہے، اور اس کی آخری خواہش یہی ہے کہ وہ حمیدہ اور اقبال کی شادی دیکھ لے!"

"میں ڈاکٹر کو بُلاتا ہوں!"

"ڈاکٹر کی اب ضرورت نہیں۔ اب وہ نہیں بچ سکتی۔ میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں، جاؤ، جلدی کرو!"

نواب نے پوچھا:

"لیکن اقبال اور ثریّا؟"

"ہاں ـــــ وہ سچ بھی ہے اور غلط بھی۔"

"کیا کہا؟"

"یہ سچ ہے کہ اقبال سے ثریّا محبّت کرتی ہے، لیکن یہ غلط ہے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ میں اپنی بچّی کو پہچانتی ہوں۔ اب مجھے دق نہ کرو۔ جاؤ اپنا کام کرو!"

نواب صاحب رونے لگے۔ بیگم نے کہا:

"مجھ سے سبق لو۔ مجھے تم سے زیادہ رونا آ رہا ہے۔ میں تم سے زیادہ روؤں گی، لیکن ابھی نہیں ـــــــ اب اگر تم نہ گئے تو میں خود برقعہ اوڑھ کر باہر جاؤں گی۔ اور اپنی بچّی کی مراد پوری کروں گی!"

نواب صاحب گھبرائے ہوئے باہر آئے اُنھوں نے اقبال کو الگ بُلایا:

"تمھاری شادی حمیدہ سے ہو رہی ہے!"

وہ چکرا گیا۔

"کیا فرمایا؟"

"ثریا شادی پر رضامند نہیں ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ قاضی صاحب واپس نہ جائیں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے حمیدہ کو دُلہن بنایا ہے اور اس پر اڑ گئی ہے کہ اس کی شادی تمھارے ساتھ کر دی جائے ـــــــ بیٹے، اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گی۔ ضدی اور خود سر لڑکی ہے۔ میں نے اور بیگم نے اس کی ہر ضد ہمیشہ پوری کی ہے۔ یہ ضد بھی اس کی میں پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمھیں اختلاف نہ ہو؟"

اقبال خاموش رہا۔ نواب صاحب نے کہا:

"بولو کیا کہتے ہو؟"

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ جو آپ حکم دیں گے، میں وہی کروں گا!"

"تو آؤ!"

اقبال قاضی صاحب کے سامنے بیٹھ گیا۔ نواب صاحب نے دُلہن کا نام کاغذ پر لکھ کر قاضی صاحب کو دے دیا۔ نکاح ہو گیا۔ ندیم اور مصاحب ثریا کے بجائے حمیدہ کا نام سُن کر بہت متحیّر ہوئے۔ لیکن یہ موقع بحث و گفتگو کا نہ تھا۔ رسم نکاح کے فوراً بعد، اندر سے بلاوا آیا۔ نواب صاحب اقبال کو لے کر اندر پہنچے، سارا گھر وہیں جمع تھا۔ حمیدہ دُلہن بنی ہوئی ثریا کے پاس بیٹھی تھی دوسری طرف اقبال دولھا بنا ہوا بیٹھ گیا۔ ثریا خاموشی سے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اس کی آنکھیں دروازہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اقبال کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے ثریا کے

چہرے پر چمک آئی اور فوراً غائب ہو گئی۔ اس نے اقبال اور حمیدہ کا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ سے ملاتے ہوئے اقبال سے کہا:

"حمیدہ کا خیال رکھیے گا۔ بڑا آب دار موتی میں نے آپ کے ہاتھ میں دیا ہے ـــــ حمیدہ کو آخری تحفہ کے طور پر میں نذر کرتی ہوں۔ اسے قبول کیجیے۔ اسے احتیاط سے رکھیے۔ اگر آپ نے میرے اس آخری تحفہ کے ساتھ کبھی بے پروائی برتی۔ تو اب میں آپ کو معاف نہیں کروں گی!"

اقبال سر جھکائے ثریّا کی باتیں سنتا رہا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا، کہ اس کی آنکھ سے گرم گرم آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا، اور ثریّا کے ہاتھ پر گرا۔ وہ چونک پڑی۔ اس نے ایک نظر اقبال پر ڈالی۔ اور کہا:

"اچھا اب رخصت!"

اقبال اپنے کمرے میں چلا آیا۔ حمیدہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نواب صاحب باہر آ گئے۔ بیگم صاحبہ بھی اپنی بارہ دری میں پہنچ گئیں۔ صرف زبیدہ چٹان کی طرح اپنی جگہ جمی بیٹھی تھی۔ جب سب چلے گئے، تو ثریّا نے زبیدہ سے کہا:

"کہو، جیت کس کی ہوئی؟"

زبیدہ نے آہستہ سے کہا:

"تمھاری!"

ثریّا نے بہت کمزور آواز میں کہا:

"مجھے بہت افسوس ہے کہ تم مجھے بالکل سمجھ نہ سکیں!"

زبیدہ رونے لگی۔ اس نے کہا:

"اب میں سمجھ گئی۔ معاف کر دو ثریّا، میں تمھاری مجرم ہوں!"

"یہ نہ کہو زبیدہ، تم میری بہن ہو ——— زبیدہ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ رہا ہے، امّی کو بلاؤ!"

زبیدہ دوڑی دوڑی گئی اور بیگم صاحبہ کو بلا لائی۔ وہ جب پہنچیں، تو اُس کا سانس اُکھڑ چکا تھا۔ ماں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن بے قرار ماں اس وقت صبر کا مجسّمہ بنی ہوئی تھی۔ اس نے سرہانے بیٹھ کر یٰسین کی تلاوت شروع کر دی اور اشارے سے نواب صاحب کو بُلانے کا حکم دیا۔ زبیدہ نواب صاحب، حمیدہ، اقبال سبھی کو بلا لائی۔ اور جب یہ سب کمرے میں پہنچے ہیں۔ تو وہ آخری سانس لے رہی تھی۔ نواب صاحب اور اقبال دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ لیکن بیگم صاحبہ بدستور سرہانے بیٹھی تلاوت کر رہی تھیں۔ ماں کی ممتا اپنے فرض سے کبھی غافل نہیں ہوتی۔

رئیس احمد جعفری کے بہترین ناول

بالاکوٹ	شہادت گاہ حق و باطل کا آخری باب	-/۱۰
سلطانہ	تقدیر کے پر جلتے ہیں تدبیر کے آگے	-/۵
خوں بہتا رہا	ایک تاریخ ـــــ ایک داستان	-/۸
گردِ کارواں	سسلی (صقلیہ) میں مسلمانوں کے عروج و زوال اور عیسائیوں کے ظلم و جور کی خوں چکاں داستان	-/۸
شہلا	"بڑی دلچسپ ہے یہ بھی کہانی"	-/۸
چنگاری	"کچھ بڑھ کے ہے یہ برق سے شعلہ سے شرر سے"	-/۵
الناصر	اندلس کے قصر زہرا کی ایک حسین و جمیل داستان	-/۵
حق و باطل	سرزمین عرب کی لرزہ خیز داستان	-/۶
ٹھوکر	وہ میرے صبر کا کب تک مقابلہ کرتے	۲/۵۰
عورت	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک	-/۵
مجاہد	آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں	-/۵
دل	کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے	-/۶
ایک مہاجر	دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز	-/۴
اسی کا نام دنیا ہے	ــــ جہاں سب کچھ ہے اور کچھ نہیں	-/۱۲

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز
لاہور ــــ کراچی ــــ حیدرآباد ــــ پشاور